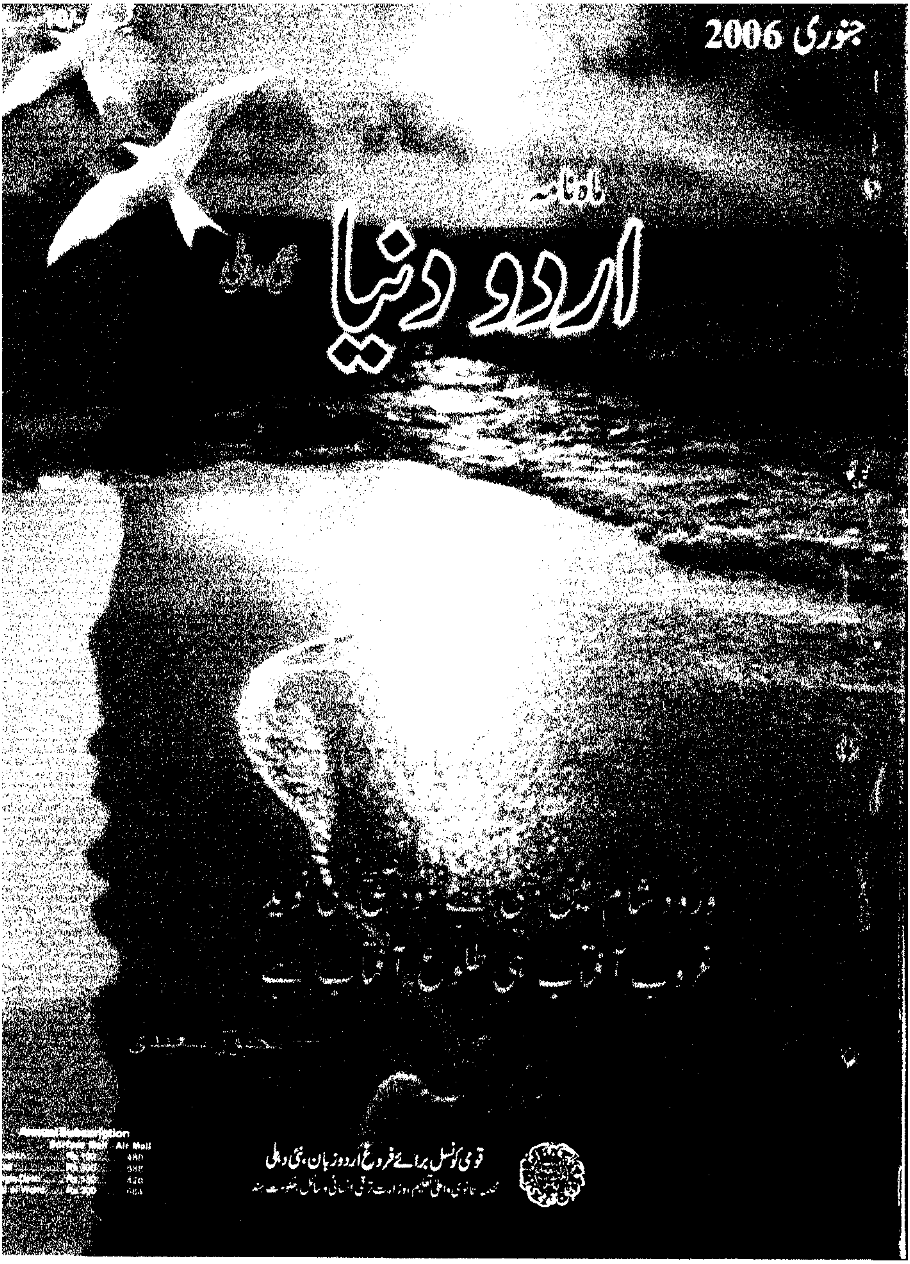
جنوری 2006
ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
Air Mail

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## دیوان حسرت عظیم آبادی

**مرتبہ: ڈاکٹر اسما سعیدی**

حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے بھی شائع کیا تھا۔ یہ ان کا مکمل دیوان ہے، جس پر فاضل مرتبہ نے اپنے مقدمے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

**صفحات: 484، قیمت -/100 روپے**

## دکن میں اردو

**مصنف: نصیر الدین ہاشمی**

یہ کتاب دکنیات کے سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب کے بعض بیانات سے بعد کے محققین نے جو اختلاف کیا ہے پیش لفظ میں مصنف کی جانب سے اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

**صفحات: 945، قیمت -/202 روپے**

## خسرو شناسی

**مرتبین: ظ. انصاری، ابو الفیض سحر**

امیر خسروؒ کے لیے ایک شاعر نے کہا ہے:

خسرو اک البیلا شاعر جس کے روپ ہزار
کہیں وہ صوفی، کہیں مورخ، کہیں وہ موسیقار

اس کتاب میں حضرت امیر خسروؒ کی ہمہ جہت شخصیت کی ہر جہت کا جائزہ ان قلمکاروں نے لیا ہے جو اپنے عہد کی اس عظیم شخصیت سے خاص شغف رکھتے ہیں۔

**صفحات: 368، قیمت: -/80 روپے**

## دکن میں مرثیہ اور عزاداری

**مصنف: ڈاکٹر رشید موسوی**

دکن میں مرثیہ نگاری اور عزاداری کی روایت بہت قدیم ہے۔ دیگر اصناف سخن کی طرح قدیم ترین مرثیے بھی دکنی شاعروں ہی سے یادگار ہیں۔ مصنف نے اس کتاب میں حیدرآباد کے علاوہ میسور، مدراس اور ممبئی میں لکھے جانے والے مرثیوں کا احاطہ بھی کیا ہے جس سے کتاب کی جامعیت بڑھ گئی ہے۔

**صفحات: 315، قیمت: -/17 روپے**

## ذوق و جستجو

**مصنف: خواجہ احمد فاروقی**

"ذوق و جستجو" پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین میں ادبی تخلیقات کا تجزیہ ان کے تاریخی پس منظر میں کیا گیا ہے اور یہ بھی دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ فنکار فن کے سماجی اور جمالیاتی تقاضوں میں کس حد تک ہم آہنگی پیدا کر سکا ہے اور اس کے فن پاروں میں زندہ رہنے والے عناصر کس حد تک ہیں۔

**صفحات: 400، قیمت: -/34 روپے**

## ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے مورخین

**ترتیب و تدوین: محب الحسن، مترجم: مسرور ہاشمی**

یہ کتاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ تاریخ کی طرف سے منعقدہ ایک سیمینار میں پڑھے جانے والے مقالات پر مشتمل ہے۔ یہ مقالے ہندوستانی دورِ وسطیٰ کے ممتاز مورخوں کے رجحانات نیز ان کے طریقۂ کار کو سامنے لاتے ہیں اور دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کو سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ پروفیسر محمد مجیب کے قلم سے ہے۔

**صفحات: 473، قیمت -/174 روپے**

## دکنی ہندو اور اردو

**مصنف: نصیر الدین ہاشمی**

اردو زبان ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ان سبھی لوگوں کی زبان ہے جنھوں نے اسے اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ اس کتاب میں مصنف نے ارضِ دکن کے ان ہندو ادبا و شعرا کی خدمات کا جائزہ لیا ہے جنھیں اس زبان میں شہرت و انفرادیت حاصل ہوئی۔

**صفحات: 296، قیمت: -/111 روپے**

## "زمانہ" پریم چند نمبر

**مرتب: دیا نرائن نگم، تصحیح اور مقدمہ: مانک ٹالا**

"زمانہ" کانپور کا یہ خاص نمبر دو حصوں پر مشتمل ہے، حصۂ اول میں سوانحی مضامین ہیں جو پریم چند کے ذاتی واقف کاروں کے قلم سے ہیں۔ دوسرے حصے میں تنقیدی مضامین ہیں جن میں معتبر ناقدین نے پریم چند کے افسانوی فن پر گفتگو کی ہے۔ اس میں چار ضمیمے بھی شامل ہیں جن سے کتاب کی افادیت مزید بڑھ گئی ہے۔

**صفحات: 310، قیمت: -/114 روپے**

نوٹ :- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔


**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

ماہ نامہ

# اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔1 جنوری 2006

مدیر: ایس موہن

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: شہناز اختر، قومی اردو کونسل

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی - 066 110
فون: 26103381، 26103938
26179657 فیکس: 26108159

ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 24415194 - 040

## اس شمارے میں

آپ کی بات ........ خطوط ........ 2
ہماری بات ........ اداریہ ........ 5
● اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی ........ شمس الرحمٰن فاروقی ........ 6
● خط نستعلیق ........ مغنی تبسم ........ 17
● حکیم محمد کبیر الدین اور اردو ........ حکیم اشہر قدیر ........ 19
● اردو کے تئیں بنگالیوں کا بڑھتا رجحان ........ جے دیپ مجمدار ........ 21
● ہندوستان کی خلائی کامیابیاں ........ اظہار اثر ........ 23
● زراعت کا مستقبل ........ بھرت جھن جھن والا ........ 25
اتہاس کے جھروکے سے:
● ٹیپو سلطان کی شکست ........ ...ن گوپال ........ 27
گوشۂ ادب:
● پلٹنا (انشائیہ) ........ فرحت اللہ بیگ ........ 30
● آزادی مبارک (کہانی) ........ کملیشور ........ 33
● وہاب اشرفی سے گفتگو (انٹرویو) ........ شہاب ظفر اعظمی ........ 41
ہماری مطبوعات
● میرا سفر (نظم) "لفظ" سے ماخوذ ........ آل احمد سرور ........ 44
● زمین ایک سیارہ ("جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد-7 سائنسی علوم" سے اقتباس) ........ 45
طلبہ کے لیے
● میڈیکل تعلیم کے لیے مسابقتی امتحانات-2006 (کیریئر گائیڈنس کالم) سلمان عابد ........ 50
● فیصلہ لینا ........ ہیت نیر، استوتی تریمان ........ 52
● اردو زبان و ادب (کوئز) ........ سید فضل اللہ مکرم ........ 57
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-30) ........ روبینہ ناز ........ 60
اُردو خبرنامہ ........ ادارہ ........ 61
تبصرہ و تعارف ........ کتابوں پر تبصرے ........ 70
● غزل اور غزل کی تعلیم / اختر انصاری ........ مبصر: رئیس احمد
● فیودر دستوئیفسکی / ظ. انصاری ........ مبصر: سراج نقوی
● خواب مشین / سیر گھوش اور رچا نسل ........ مبصر: ایس. اے. رحمٰن
● کچھ سائنس سے / ڈاکٹر عبید الرحمٰن ........ مبصر: فیروز عالم
● "قاضی عبد الستار — فکر، فن اور فنکار" / احمد خاں ........ مبصر: احمد کفیل
بچوں کا گوشہ
● پانی کی قدر ("زمین کا آسیب اور دیگر کہانیاں" سے اقتباس) ........ نیلما سنہا ........ 75

National Council for ... Language New Delhi
ACC No. 5180/...
15/10/08
2010

# آپ کی بات

■ **محمد محفوظ عالم، مقام پوسٹ، دھرم پرسا، گوپال گنج، (بہار)**

دسمبر کا ''اردو دنیا'' حسب سابق صوری و معنوی اعتبار سے قابل قدر ہے۔ سرورق پر ممتاز پنجابی شاعرہ اور ادیبہ امرتا پریتم کی تصویر، امرتا پریتم اور معروف ہندی ناول نگار اور افسانہ نگار نرمل ورما پر اداریہ اور گوشۂ ادب کے تحت ان دونوں عظیم قلم کاروں کو خراج عقیدت نہ صرف آپ کے حسن ادارت پر دال ہے بلکہ اس بات کا غماز بھی ہے کہ آپ کی نظر اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کے ادب پر بھی رہتی ہے۔

گیسٹ کالم ممتاز صحافی جناب جی. ڈی. چندن نے ''ہندوستان میں اردو صحافت'' کے موضوع پر تحریر کیا ہے اور آزادی کے بعد سے اب تک کی اردو صحافت کی تاریخ بیان کر دی ہے۔ ان کا یہ مشورہ بہت مناسب ہے کہ علاقائی پریس کی صورت حال میں اصلاح کے لیے ایک کمیشن قائم کیا جائے اور اردو پریس کی پیشہ ورانہ اور عملی صلاحیت کو منصوبہ بند طریقے سے فروغ دیا جائے۔ اس مضمون کو انگریزی سے اردو کے قالب میں خوش اسلوبی سے ڈھالنے کے لیے مشرف علی کو مبارکباد۔

ڈرامے کی ممتاز شخصیت ''حبیب تنویر سے گفتگو'' بہت خوب ہے۔ آپ نے ان کا بہت مختصر لیکن جامع تعارف پیش کیا ہے۔ ''اردو دنیا'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ ادب، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور طب، ماحولیات، سماجیات غرض تمام موضوعات کا احاطہ کرتا ہے اور قارئین کو علم کے جملہ شعبوں سے متعلق مضامین پڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ تازہ شمارے میں سید اقبال امروہوی کا مضمون ''کارل یونگ'' اس مشہور فلسفی کے نظریات و افکار اور فرائڈ سے اس کے تعلقات پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے یونگ اور فرائڈ کے نظریات سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ امید ہے کہ ''اردو دنیا'' کے آئندہ شماروں میں دیگر عظیم فلسفیوں پر بھی ایسے ہی سیر حاصل مضامین شائع کرتے رہیں گے۔

محمد خلیل کا مضمون ''کیا گدھ محفوظ رہ سکیں گے؟'' ایک اہم ماحولیاتی مسئلے کی جانب ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ مسئلہ صرف گدھوں کے تحفظ کا ہی نہیں ہے، بلکہ دیگر بہت سے پرندوں کی تعداد بھی تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ پرندوں کے شکار اور کیڑے مار دواؤں کے مضر اثرات ان کی موت کے اہم اسباب ہیں۔ اگر ان پر بروقت قابو نہ پایا جا سکا تو شدید ماحولیاتی بحران پیدا ہو جائے گا۔

''طلبہ کے لیے'' میں فوڈ ٹیکنالوجی میں کیریئر، کمپیوٹر پر مضمون اور اردو زبان و ادب کوئز انعامی مقابلہ معلوماتی اور بے حد مفید ہیں۔

'مرزا دبیر کی نثر نگاری' ایک عمدہ مضمون ہے جس میں اس عظیم مرثیہ گو کی نثری کتاب ''ابواب المصائب'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ مرزا سلامت علی دبیر ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نثر نگار بھی تھے۔

''ابتدائی مدارس میں رہنمائی''، تعلیمی عمل سے تعلق رکھنے والے حضرات کے ساتھ ساتھ عام قارئین کے لیے بھی ایک مفید مضمون ہے جس میں طلبہ کی مناسب رہنمائی اور تربیت سے متعلق مشورے پیش کیے گئے ہیں۔

''اردو خبرنامہ'' رسالے کا ایک اہم حصہ ہے جس کے مطالعے سے اردو سے متعلق تمام قومی اور بین الاقوامی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

آپ نے اس بار جن کتابوں پر تبصرے شائع کیے ہیں وہ بھی بہت اہم ہیں۔ پروفیسر مشیر الحسن کی کتاب ''اتحاد سے انتشار کی طرف۔ کلونیل اودھ کے قصبات'' پر محترم مخمور سعیدی کا تبصرہ عالمانہ اور بے لاگ ہے۔ نور الٰہی اور محمد عمر کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' پر فیاض عالم، ''تعلیمی رہنمائی اور صلاح کاری'' پر ڈاکٹر رئیس احمد، مشرف عالم ذوقی کے ناول ''پوکے مان کی دنیا'' پر ڈاکٹر فیروز عالم اور ''آل احمد سرور کے تبصرے'' پر ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے تبصرے فن تبصرہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔

بچوں کے گوشے میں آپ نے ایشور چندر ودیا ساگر سے متعارف کرایا ہے۔ آج ہمارے ملک اور معاشرے کو ایسے ہی سادہ لوح اور محب وطن افراد کی ضرورت ہے۔ قوی امید ہے کہ یہ رسالہ اپنا مزاج اور معیار ہمیشہ قائم رکھے گا۔

■ **غزالہ نگار، کاشانۂ شفیق، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھو پور، راجستھان**

''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ (دسمبر 2005) باصرہ نواز ہوا۔ سرورق پر امرتا پریتم کی تصویر کے ساتھ ساتھ ولادت و وفات کی تاریخیں بھی دیکھنے کو ملیں، بہت افسوس ہوا۔ موت سے کسی کو مفر نہیں، یہ زندگی کا کڑوا سچ ہے اسے تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن مرحومہ اپنی نگارشات کے ذریعے ہمیشہ ہمارے اردگرد موجود رہیں گی اور اپنی عدم موجودگی کا احساس کبھی نہ ہونے دیں گی۔ ان کی ایک نظم کے یہ مصرعے دل کو چھو گئے۔

میں تمھیں پھر ملوں گی
کہاں؟ کس طرح؟ نہیں معلوم
شاید تیرے تخیل کی چنگاری بن کر
ترے کینوس پر اتروں گی

یا شاید ترے کینوس کے اوپر
ایک پراسرار لکیر بن کر
خاموش تمھیں دیکھتی رہوں گی......

شمارے کے دیگر مشمولات میں ''ہندوستان میں اردو صحافت''، حبیب تنویر سے گفتگو اور'' کارل یونگ'' نے بہت متاثر کیا، علاوہ ازیں گوشۂ ادب کے تحت ''الوداع امرتا پریتم'' اور'' روشنی گویا شفاف اندھیرے میں نہائی ہوئی''، ایک بہتر انتخاب ہے جس کے لیے آپ کی ادارت لائق تحسین ہے۔ ''مرزا دبیر کی اردو نثر نگاری'' بھی ایک سیر حاصل مقالہ ہے جس کے لیے پروفیسر مرزا محمد زماں آزردہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ'' مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے'' موصوف کی ایک مستند اور معیاری تصنیف ہے۔ ''بچوں کا گوشہ'' کے تحت ایشور چندر ودیا ساگر کے احوال و کوائف باعث عبرت ہیں۔

کیا لوگ تھے جو راہ وفا سے گزر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

بحیثیت مبصر محترم مخمور سعیدی، ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر رئیس احمد نے خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ اس معیاری اشاعت پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **پروفیسر مجیب الرحمن، ڈوشی انکلیو، 3/121، پارک میرا روڈ، ضلع تھانہ (مہاراشٹر)**

دسمبر آنے سے پہلے ہی دسمبر کا شمارہ موصول ہوا۔ رسالہ حسب معمول اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ میرا خیال ہے کہ اتنا معیاری رسالہ ہونے کے باوجود یہ عام اردو طبقے سے روشناس نہیں۔ بہت سے اردو داں یہ جانتے ہی نہیں کہ حکومت کی سرپرستی میں اتنا خوبصورت جریدہ شائع ہوتا ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے یہ رسالہ ریلوے اسٹیشنوں پر بک اسٹالوں میں بھی دستیاب ہونے لگے؟ اپنے پرکشش گیٹ اپ کی وجہ سے یہ قارئین کی توجہ کا باعث ہوگا۔

دسمبر کے شمارے میں تمام مضامین معیاری ہیں لیکن سید اقبال امروہوی کا مضمون'' کارل یونگ'' بہت جامع اور مربوط مضمون ہے۔ کارل یونگ کے بارے میں اتنی معلومات تو ان لوگوں کو بھی نہیں جو نفسیات پڑھاتے ہیں۔ Archetype کے لیے آثار اولی اور شیڈو کے لیے ہمزاد کی اصطلاحات بہت خوب ہیں اور اس مفہوم کو واضح کرتی ہیں جو ان الفاظ کے لیے یونگ کے ذہن میں ہوگا۔ ہندوستان میں اردو صحافت بھی ایک بہت عمدہ مقالہ ہے اس میں دی گئی معلومات چونکا دینے والی ہیں۔

■ **محمد آفتاب عالم، گوالہ پاڑہ، انکس، ہگلی (مغربی بنگال)**

میں'' اردو دنیا'' کا مطالعہ باقاعدگی سے کرتا ہوں۔ گذشتہ تین شمارے مجھے بے حد پسند آئے۔ یہ رسالہ نہایت ہی معلوماتی ہے اور ہر طرف علم کی روشنی پھیلا رہا ہے۔ اس میں ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ اردو کی ترویج و ترقی سے بھی واقف کرایا جاتا ہے۔

آپ نے انٹرویو کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، بہت مفید ہے کیونکہ اس سے ہمیں مختلف اکابرین کے بارے میں جاننے کا موقع ملتا ہے۔ نومبر کے شمارے میں سید حامد سے گفتگو بہت ہی اہم ہے۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ جس زبان نے ہندوستان کی آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، آج اسے گری پڑی ہوئی زبان سمجھ کر اس کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جارہا ہے۔

کوئز کا سلسلہ بھی بہت معلوماتی ہے۔ احمد جمال پاشا کا میں نے صرف نام سنا تھا لیکن ''اردو دنیا'' نے ان سے ملاقات بھی کرادی۔ یہ ایک اتفاق ہی ہے کہ اب ایسی شخصیتیں ہمارے درمیان موجود نہیں۔ اگر اسی طرح اردو ادب کے دیگر ادیبوں سے متعلق مضامین بھی شائع کریں تو اچھا ہوگا۔ نئے لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی کرنے کی ضرورت ہے۔

**ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر شمارے میں ایک عظیم شخصیت سے گفتگو یا ملاقات کے ذریعے قارئین "اردو دنیا" کو متعارف کرایاجائے۔ علاوہ ازیں ادبی گوشہ کے تحت اچھے لکھنے والوں کی تحریروں سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے.**
**(ادارہ)**

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چونا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی-1 (جھارکھنڈ)**

''اردو دنیا'' برابر بک اسٹال پر بروقت دستیاب ہوجاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوجاتا ہے۔ ستمبر کے شمارے کا بھی یہی حال ہوا۔ ایک ہفتے کے اندر ہی ستمبر کی ساری کاپیاں ختم ہوگئیں۔ بہرحال آپ کا اداریہ بے حد اہم مسئلے پر ہے۔ ہندوستانی معیشت اگرچہ 7.80 فی صد سالانہ کی شرح سے ترقی کررہی ہے مگر دہشت گردی کی وجہ سے کئی صوبے متاثر ہیں اور ترقی میں دہشت گردی حاوی ہے۔

ڈاکٹر مولا بخش کا مضمون'' اردو زبان اور نئی نسل'' عمدہ ہے۔ انھوں نے نئی نسل کے نوجوانوں کو اردو سے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کے بارے میں صحیح جانکاری دینے کی کوشش کی ہے تاکہ نئی نسل اردو تہذیب کا ایک نیا ایوان تعمیر کرنے کی سمت میں گامزن ہو۔ کرشن کمار سے گفتگو، اردو نصاب کی ترتیب میں ترجمہ اور ابلاغیات، چاند — بعض نئے حقائق، شیروں کی کم ہوتی تعداد، عمدہ اور معلوماتی مضامین ہیں۔

''اردو دنیا'' کے تبصرے بھی اول درجے کے ہوتے ہیں۔ اس شمارے میں غضنفر کے ناول'' وش منتھن'' پر ڈاکٹر فیروز عالم کا تبصرہ بہت اچھا ہے۔ انھوں نے

"وش منتھن" کا منتھن کرنے کے بعد ہی تبصرہ سپرد قلم کیا ہے۔ بچوں کے گوشے میں "کانچ بنانے کا فن"۔ نہ صرف بچوں کے لیے بلکہ بڑوں کے لیے بھی ایک معلوماتی مضمون ہے۔ نومبر کے شمارے میں سرورق پر امام الہند ابوالکلام آزاد کی تصویر دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ یہ بات بھی لائق صد ستائش ہے کہ آپ نے پیدائش کی جگہ "آمد" اور موت کی جگہ "رخصت" لکھا ہے۔ دوسرے لوگوں کو اس کی تقلید کرنی چاہیے۔

"ہماری بات" کے تحت آپ نے پُرمغز اداریہ "Right to information" پر سپرد قلم کیا ہے۔ ہندوستان میں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہوتی جارہی ہیں اس کی ایک تازہ مثال ملک کے عوام کو اطلاع حاصل کرنے کا حق تفویض کیا جارہا ہے۔ اظہار احمد ندیم کی سید حامد سے گفتگو بھی بہت خوب ہے۔ "اردو زبان کا دستوری و قانونی موقف" اردو ادب اور سائنس "بجلی"، "چھوٹی صنعتوں کی اہمیت"، "معدے کی سوزش" وغیرہ تمام مضامین کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ "وراثت کی جنگ" اور عبدالماجد دریا آبادی کا "خیر مقدم" مجھے پسند آئے۔ رشید الدین خاں کا مضمون "مولانا آزاد تاریخ ساز شخصیت" بے حد عمدہ اور پُرمغز ہے۔ غرض کہ نومبر کا شمارہ گراں قدر ہی نہیں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

■ **ڈی۔این۔دھون، جی۔1، جنگپورہ ایکسٹینشن، نئی دہلی۔110014**

ہمارے رسالوں میں "اردو دنیا" ایک ہشت پہلو ستارہ ہے جو ہر ماہ اس زمین پر دن اور رات اپنے جلوے دکھاتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں خوبی مرنے والوں کی یاد تازہ اور شگفتہ کرنے والی اس کی سرورق کی تصویریں ہوتی ہیں۔ چنانچہ دسمبر کے شمارے میں امرتا پریتم کی تصویر کتنی ہی یادوں اور نظموں کو واپس لاتی ہے اس پر مستزاد آپ کا اداریہ "ہماری بات" ہے جس میں اس عظیم پنجابی ادیبہ کے ساتھ ہندی کہانی کار نرمل ورما کو بھی خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ آپ کے اداریے کے جملوں میں معاملہ فہمی کے جواہر ہیں۔ مثلاً "امرتا پریتم کی نظموں میں ایک عورت کی تلاش کی روداد ہے۔ عشق اس تلاش کا ایک اہم ذریعہ ہے۔" اس طرح نرمل ورما سے متعلق یہ جملہ دل کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔

"موت اور زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھانے والا یہ ادیب اپنی تحریروں کی بدولت ہمیشہ ہمارے پاس رہے گا۔" کاش آپ نرمل ورما کی تصویر بھی شائع کردیتے۔ آپ کی نظر اردو ادب کے علاوہ ہر زبان اور ہر ثقافتی گوشے تک جاتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں آپ نے ملک راج آنند (انگریزی ناول نگار) نثار احمد فاروقی (اردو ادیب) سنیل دت (فلم سازی) اور ڈاکٹر رفیق زکریا (دانشور و سیاستداں) پر مضامین شائع کرکے اپنی وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے۔

ایک اور اچھی بات "اردو دنیا" میں صحافت کے موضوع پر تازہ دم اور معیاری مضامین کی اشاعت ہے۔ چنانچہ اس بار گیسٹ کالم میں "ہندوستان میں اردو صحافت" کے عنوان سے معروف صحافی جناب جی.ڈی. چندن کا وقیع مضمون ہے۔ یہ ایک واحد مضمون صحافت کی کئی کتابوں پر بھاری ہے۔ حقائق اور اعداد و شمار کی ترتیب و تدوین حوالہ جاتی ہے۔ ان کی ذہنی وسعت اور گہرائی، بالغ نظری کی مظہر ہے۔ اسی مصنف کے قلم سے حال ہی میں آپ کے گیسٹ کالم ہی میں "اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو صحافت" کے احوال پیش کیے گئے۔ اب تازہ مضمون میں بیسویں صدی میں ہندوستان کی اردو صحافت کا ٹھوس اعداد و شمار سے احاطہ کیا گیا ہے۔

اس میں اردو صحافت کی محرومیاں اور حق داریاں دونوں بڑی خوبی سے پیش کی گئی ہیں۔ اور پھر ہندوستان و پاکستان کے تعلقات کی تقویت میں اس کے افادیت سے کام لینے کی تجویز بہت صائب ہے۔ کاش اہل اقتدار اسے گرہ باندھ لیں۔ آپ کی ملی توجہات اور صحافت شناسیاں قابل ستائش ہیں۔

■ **حافظ عبدالملک، استاد۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول۔1، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھوپور، راجستھان**

ماہ نامہ "اردو دنیا" دسمبر 2005 کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اداریے کے مطالعے سے امرتا پریتم اور نرمل ورما کے انتقال پر ملال کی خبر پڑھنے کو ملی۔ زبان و ادب کے تعلق سے ان دونوں شخصیات کی موت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، لیکن کیا کیا جائے

موت سے کس کو رستگاری ہے

'ہندوستان میں اردو صحافت' کی صورت حال پر جی.ڈی. چندن صاحب کے سیر حاصل مضمون کی شمولیت پر آپ کے حسن انتخاب کی داد دینا چاہتا ہوں۔ علاوہ ازیں "حبیب تنویر سے گفتگو"، "کارل یونگ۔ ایک عظیم مفکر، فلسفی اور ماہر نفسیات" اور "خلائی تحقیقات ایک جائزہ" کے علاوہ "کیا گدھ محفوظ رہ سکیں گے" معلومات افزا مضامین ہیں۔ "گوشۂ ادب" میں شامل مضامین "الوداع۔ امرتا پریتم (امروز)" اور "روشنی گویا شفاف اندھیرے میں نہائی ہوئی" (کنور نارائن) دونوں مرحومین کے لیے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ "ہماری مطبوعات" کے تحت "مرزا سلامت علی دبیر حیات اور کارنامے" سے ماخوذ اقتباس "مرزا دبیر کی اردو نثر نگاری" قارئین "اردو دنیا" کی معلومات میں قابل قدر اضافہ کرتا ہے۔ "تبصرہ و تعارف" کے عنوان سے آپ قدیم و جدید کتب پر تبصرے پیش کرتے ہیں، آپ کے جریدے کا یہ حصہ ادبی نقطۂ نگاہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ زیر نظر شمارے میں محترم مخمور سعیدی، فیاض عالم، ڈاکٹر رئیس احمد، ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے تبصرے زیر تبصرہ کتاب سے کلی طور پر متعارف کراتے ہیں۔ غرض آپ کا یہ جریدہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" کے مصداق ہے۔

□□□

# ہماری بات

اردو موجودہ دور کی چند بڑی زبانوں میں سے ایک ہے جو اپنی جائے پیدائش کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی قبول عام حاصل کر رہی ہے۔ برصغیر ہندو پاک کے علاوہ خلیجی ممالک، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا، اسکینڈے نیویائی ممالک اور ماریشس وغیرہ میں اردو بولنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ اردو عوام نے ان ممالک میں اردو زبان کے ساتھ ساتھ اردو تہذیب و ثقافت کو بھی زندہ رکھنے کی کوشش کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہاں مشاعرے، شام غزل، شام افسانہ، مذاکرے اور ادبی جلسے متواتر منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں کافی عرصے تک اس زبان کو معتوب قرار دے کر اسے نظر انداز کیا جاتا رہا اس کی وجہ کچھ بے بنیاد شکوک و شبہات تھے لیکن دھیرے دھیرے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ گئے اور اردو کے حق میں فضا سازگار ہونے لگی۔ اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام دلوانے میں جہاں مختلف انجمنیں، ادارے، اکادمیاں اور افراد سرگرم رہے ہیں وہیں قومی اردو کونسل بھی اپنی بساط بھر کوشش کرتی رہی ہے۔ حالیہ دنوں میں کونسل نے اس زبان کی ترویج و ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں ان کے طفیل اردو کے تئیں عوامی رویے میں مثبت تبدیلی آئی ہے اور اس زبان کی اہمیت کے پیش نظر زندگی کے ہر شعبے میں اس کی ضرورت و افادیت محسوس کی جانے لگی ہے۔ فلم اور ٹیلی ویژن میڈیا میں اپنی شیرینی اور اثر آفرینی کی وجہ سے اردو کافی مقبول ہے۔ اداکار ہوں یا گلوکار، اس وقت تک اپنا تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک کہ ان کا تلفظ دلکش نہ ہو اور تلفظ کو دلکش بنانے میں اردو بہت معاون ہوتی ہے۔ اردو کی اس خوبی کی وجہ سے الیکٹرانک میڈیا میں اس کی بڑی مانگ ہے۔ نہ صرف مکالمہ نگاری، منظر نامہ نگاری اور نغمہ نگاری کے میدان میں اردو جاننے والے افراد کو زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے بلکہ زبان کے معاملے میں حساس ہدایت کار اپنی ٹیم میں ایک لینگویج سپروائزر کو بھی شامل رکھتے ہیں تاکہ اداکار/ اداکارائیں صحیح تلفظ کے ساتھ مکالمے بول سکیں۔

اردو کی ترویج و اشاعت اور اس زبان کو سیکھنے والوں کی سہولت کے مدنظر قومی اردو کونسل ہندی اور انگریزی کے ذریعے اردو سکھانے کے لیے ایک سالہ ڈپلوما کورس چلا رہی ہے۔ اس کورس کو ملک کے طول و عرض میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے اور اس میں ہر عمر، مذہب، پیشے، طبقے اور علاقے کے لوگوں نے داخلے لیے ہیں۔

عوام کو اردو زبان سے روشناس کرانے کی مہم میں ملک کے ہر گوشے اور ہر خطے میں قومی اردو کونسل نے اردو ڈپلوما کورس کے لیے 145 مطالعاتی مراکز (Study Centres) قائم کیے ہیں جن میں 7066 افراد نے داخلے لیے ہیں۔ ان کے علاوہ براہ راست قومی اردو کونسل سے 400 شائقین یہ کورس کر رہے ہیں۔ ہندی کے ذریعے اردو سیکھنے والوں کی تعداد 3576 ہے جب کہ انگریزی کے ذریعے 2090 افراد یہ زبان سیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے 184 کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی سینٹروں کے 11500 طلبہ کے لیے بھی یہ اردو ڈپلوما کورس کرنا لازمی ہے۔

کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے اس کورس کی مقبولیت کا اندازہ معروف انگریزی ہفت روزہ ''آؤٹ لک'' (24 اکتوبر 2005) میں شائع شدہ اس رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے جس میں مغربی بنگال کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ '' وزارت ترقی انسانی وسائل کے ماتحت ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے چلائے جانے والے ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس میں داخلہ لینے والے غیر مسلموں کی تعداد گذشتہ سال 155 تھی اور اس سال اس تعداد سے تگنی بھگ دو گنے افراد نے وسط ستمبر سے شروع ہوئے اس کورس میں داخلہ لیا ہے۔''

اردو کو ہر مذہب اور ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچا کر کونسل نے اس حقیقت پر مزید مہر ثبت کر دی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، یہ ہر ہندوستانی کی زبان ہے اور اس کی خاطر خواہ ترقی اسی وقت ممکن ہے جب تمام ہندوستانیوں میں اسے قبول عام حاصل ہو جائے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو کی طرف عوامی رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ امید کی جانی چاہیے کہ یہ رجحان اسی طرح بڑھتا رہے گا اور اردو اپنا کھویا ہوا مقام جلد ہی دوبارہ حاصل کر لے گی۔

□□□

تحریر: شمس الرحمٰن فاروقی

ترجمہ: اطہر فاروقی

# اسکول کی تعلیم کے ذریعے ہندوستان میں اردو کی بقا کی حکمت عملی

آج کی شام، چھٹے ذاکر حسین یادگاری خطبے کے موقعے پر ممتاز سامعین کے سامنے ہندوستان میں اسکول کی تعلیم کے ذریعے اردو کی بقا کی حکمت عملی کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے میں فخر محسوس کر رہا ہوں۔ معمولی ہی سا سہی لیکن ایک ایسی بحث گاہ کے ذریعے یہ فرض ادا کرنا میرے لیے باعث توقیر ہے جس کا واحد مقصد اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کے ذریعے اردو زبان کے احیا کے لیے ممکن حد تک ڈاکٹر ذاکر حسین کے افکار و خیالات سے روشنی حاصل کرنا بھی ہے۔ اردو تعلیم سے متعلق ذاکر حسین اسٹڈی سرکل نے پہلی بار ایسی سنجیدہ بحث کا موثر انداز میں آغاز کیا ہے جس کے بارے میں مجھے توقع ہے کہ وہ جلد یا بدیر بار آور ضرور ہوگی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کا اردو کے باب میں سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ اس فورم نے سستی مقبولیت حاصل کرنے والے تمام نظریات کی نفی کو اپنے گوشوارۂ عمل میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین ہندوستان کے نہ صرف ایک بڑے ماہر تعلیم تھے بلکہ اردو کے مقصود کے لیے سرگرم اور اہم کارکن بھی تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس مہم کے بھی قائد تھے جس کے تحت ساڑھے بائیس لاکھ دستخط جمع کر کے 15 فروری 1954 کو صدر جمہوریہ ہند کو ایک محضر پیش کیا گیا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ اردو کو آئین کی دفعہ 347 کے تحت اتر پردیش کی علاقائی زبان تسلیم کیا جائے۔ (1) یہ بڑا مناسب مطالبہ تھا کیوں کہ اتر پردیش لسانی طور پر اردو ہی کا علاقہ ہے۔

یہ تلخ حقیقت آزادی کے بعد ہماری تاریخ اردو کا افسوس ناک باب ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس محضر کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا بلکہ یہ بھی کہ صدر جمہوریہ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد خود ڈاکٹر ذاکر حسین بھی اردو آبادی کے آئینی حق کو تسلیم کرانے کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ وجہ جو بھی ہو مگر ایسی شہادت نہیں ملتی کہ صدر جمہوریہ کے عہدے پر متمکن ہونے کے بعد کبھی انھوں نے اس محضر یا اس کے مطالبات کی طرف توجہ کی ہو۔

آزاد ہندوستان کی اس افسوس ناک تاریخ کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ آئینی اور سیاسی وجوہ سے جواہر لال نہرو جیسے رہنما نے بھی اردو داں آبادی کے اس پوری طرح سے درست آئینی مطالبے کو ایسا مطالبہ قرار دیا جو آئینی بحران پیدا کر سکتا تھا۔ نہرو کا یہ بیان ہمیں بتاتا ہے کہ تقسیم کے بعد اردو سے متعلق جواہر لال نہرو جیسے قد آور قومی رہنما بھی کس طرح کے خوف میں مبتلا تھے (2)

لیکن یہاں میرا مقصد تاریخ کے تلخ حقائق کی تکرار کرنا نہیں ہے کہ اب اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ایک دو باتوں کا مختصر ذکر کر کے میں ان بنیادی سوالات کی طرف توجہ کروں گا جن کے بارے میں اپنے خیالات میں آج کی شام آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں یعنی اسکول کی تعلیم کے ذریعے اردو زبان کا احیا۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ بدیر ہی سہی، اب اردو داں آبادی اپنے جائز آئینی مطالبات کے لیے صحیح لائحۂ عمل اختیار کرنے کی سمت پیش رفت کر رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت آج کی شام مجھے اس موضوع پر بولنے کے لیے مدعو کیا جانا بھی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں اردو کے حقوق کے مطالبات کا لہجہ سیاسی سے زیادہ علمی ہوا ہے اور آزادی کے بعد سے لے کر کچھ مدت پہلے تک مسلم رہنما اور خود نام نہاد اردو قیادت اردو کے احیا کے لیے جو بے سر پیر کے مطالبے کرتی رہی تھی ان میں قابل ذکر طور پر کمی آئی ہے۔ بلاشبہ اسکول کی تعلیم کے ذریعے اردو کا احیا، اور ہندوستان جیسی جدید جمہوری ریاست میں اس زبان کی بقا، جمہوریت کی بقا کا واحد راستہ ہے۔

مگر آگے بڑھنے سے پہلے یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسکول کی سطح پر اردو تعلیم سے کیا مراد ہے؟ ''اردو تعلیم'' کی اصطلاح اور اس فقرے کو بھی اردو کے سیاست دانوں نے بہت الجھایا ہے۔ ہمیں صرف ان ہی گنجائشوں کا مطالبہ کرنا چاہیے جو ہندوستان کے موجودہ نظام تعلیم میں دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح اردو کے لیے بھی ممکن ہیں۔ مثلاً صرف آئین کی آٹھویں جدول میں شامل زبانیں ہی اصولاً سرکاری اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہیں۔ یعنی حکومت ہند یا کوئی صوبائی حکومت انگریزی ذریعۂ تعلیم پر مبنی ابتدائی سے ثانوی درجات تک تعلیم دینے والے اسکول نہیں کھول سکتی۔ ابتدائی سطح پر،

آئین کی دفعہ 350۔الف کے مطابق حکومت صرف مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا نظم کرسکتی ہے۔ بچے کی جو بھی مادری زبان ہو، ابتدائی سطح پر حکومت کو اسی زبان میں بچے کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے۔ انگریزی کے باب میں اردو والوں کے ذہن بلاوجہ خلفشار کا شکار ہیں۔ اس لیے اکثر دہلی جیسے شہروں میں اردو قیادت اردو آبادی کے لیے سرکاری اسکولوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کی سہولت کا بے معنی مطالبہ کرتی ہے۔

ذریعۂ تعلیم کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ کسی دوسری زبان کی تعلیم نہیں ہوگی۔ اگر بچہ شمالی ہند کے کسی اردو ذریعۂ تعلیم ابتدائی اسکول میں داخل ہوتا ہے تو وہ تیسری کلاس سے صوبے کی اہم ترین زبان (Principal Official Language) پڑھے گا اور چھٹی کلاس سے انگریزی۔

سہ لسانی فارمولے میں زبان اول کا کالم مادری زبان کے لیے مخصوص ہے۔ یعنی اگر شمالی ہند کے کسی ہندی میڈیم اسکول میں بچہ تعلیم حاصل کر رہا ہے تو وہ تیسری جماعت سے زبان اول، اور مادری زبان کی حیثیت سے اردو پڑھے گا اور چھٹی جماعت سے انگریزی۔ بدقسمتی سے سہ لسانی فارمولے کے عمل درآمد میں اردو مادری زبان والے بچوں کے آئینی حق کو غصب کیا گیا جو ان کے ساتھ سب سے بڑی زیادتی تھی، اور آج بھی ہے۔

اسکول کی سطح پر ذریعۂ تعلیم ایک بات ہے اور اختیاری زبان کے طور پر اردو پڑھنا بالکل دوسری بات۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکولوں میں بھی علاقائی زبانیں بالعموم زبان اول کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں، کیونکہ زبان اول کا کالم ہے ہی مادری زبان کے لیے۔ مگر اردو کے ساتھ یہاں بھی زیادتی ہوئی ہے اور اس زیادتی کی وجہ صرف یہ ہے کہ اردوداں والدین اپنے بچوں کے اس حق کا مطالبہ اسکول سے نہیں کرتے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم اسکولوں میں اگر اردو کہیں پڑھائی بھی جاتی ہے تو وہ بھی زبان سوئم کے طور پر۔

سہ لسانی فارمولا اصلاً حسب ذیل ہے اور اردو کے سوا دوسری تمام زبانوں کے ذیل میں اسی طرح نافذ بھی ہے:

زبان اول: مادری زبان

زبان دوئم: غیر ہندی علاقوں میں ہندی، اور ہندی علاقوں میں جنوبی ہند کی کوئی زبان

زبان سوئم: انگریزی یا کوئی اور جدید یورپی زبان

یہ خوش گوار اتفاق ہے کہ اردو اور اس کی تعلیم پر بات کرنا اب صرف ان لوگوں کا مسئلہ نہیں رہ گیا جو بطور استاد خود کسی سطح پر اردو پڑھانے، یا پھر اردو کی سیاست سے وابستہ ہیں۔ بہار، مہاراشٹر، آندھرا پردیش اور دہلی میں اردو کو جو بھی تھوڑی بہت جگہ، اور اردو کے احیا کی تحریک کو جو تھوڑی بہت کامیابی ملی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اب اردو کا مسئلہ ان سیاست دانوں کے گوشوارۂ عمل سے باہر آگیا ہے جو صرف زبانی جمع خرچ سے اردو سیاست کی دکان چلاتے رہے تھے۔ گذشتہ چند برسوں میں ملک کی عمومی سیاسی فضا میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ اردو کے مقصود کو اب ان لوگوں نے بھی آگے بڑھایا ہے جو اردو میں معلمانہ سیاست یا مسلمانوں کے ووٹ کے ٹھیکیدار نہیں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اتر پردیش میں اردو کے ابتر حال کا سبب صرف اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ وہاں اس کے عمائدین میں اردو کے حقیقی بولنے والے نہیں بلکہ یونیورسٹیوں کی سیاست کے ماہرین اور مسلم ووٹوں کے ٹھیکیدار شامل رہے ہیں۔ انھوں نے کبھی اس سوال کو اٹھایا ہی نہیں کہ اگر اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کا مناسب نظم نہ ہوگا تو زبان کے طور پر بھی اردو کا فروغ ممکن نہیں۔ نتیجے کے طور پر معاصر اردو ادب کے معیار میں بھی انحطاط آیا اور قارئین کا حلقہ تو تنگ ہوا ہی۔

میری رائے میں اردو کی صورت حال کے تاریخی اور تہذیبی لوازم کی تفہیم میں اردو عمائدین اس لیے ناکام ہوئے کہ گذشتہ نصف صدی میں اردو تعلیم کے فروغ کی حکمت عملی بھی وہی رہی ہے جسے میں ''بغیر سوچے سمجھے صرف مطالبے کی سیاست'' کا نام دیتا ہوں۔ مثلاً تقسیم کے فوراً بعد اردو قیادت نے مطالبہ کیا کہ حکومت اردو کو (خصوصاً شمالی ہند کی ریاستوں میں) دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے۔ یہ مطالبہ کرتے وقت عمائدین یہ بھول گئے کہ کسی زبان کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے دینے کا اردو تعلیم سے کچھ تعلق نہیں۔ حکومت اگر چاہے بھی تو اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا کر اردو تعلیم کو مہیا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی ہے۔ دوسری سرکاری زبان سرکاری دفاتر میں صرف مخصوص مقاصد کے لیے Official Language Act میں ترمیم کرکے استعمال کی جاسکتی ہے۔ لیکن کسی ریاست کے اسکولوں میں اگر اردو تعلیم مہیا نہ ہوگی تو پھر سرکاری دفاتر میں اردو کا استعمال کرے گا کون؟ یہ بات اردو قیادت کی سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ کچھ مدت بعد بغیر سوچے سمجھے یہ بھی مطالبہ کیا گیا کہ مرکزی حکومت کو اردو کے فروغ کے اقدام کرنا چاہیے کیوں کہ اردو کا اپنا کوئی علاقہ نہیں ہے۔

یہ مطالبہ کرتے وقت اردو قیادت یہ بھی بھول گئی کہ آئینی طور پر ابتدائی سے ثانوی سطح تک کی تعلیم مکمل طور پر ریاستوں کے دائرۂ اختیار کا معاملہ ہے۔ مرکزی حکومت صرف ثقافتی اداروں کے ذریعے اردو ادب یا ثقافت کے فروغ کے لیے کچھ اقدام کرسکتی ہے جس کے لیے مرکزی حکومت کو کبھی کوئی عذر نہیں۔ ہاں مگر مرکزی حکومت ابتدائی اور ثانوی سطح کی تعلیم کے معاملے میں مداخلت کرنے کی قطعی مجاز نہیں ہے۔ مرکزی حکومت یو.جی.سی. کے ذریعے

یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں اساتذہ کا تقرر تو کرسکتی ہے اور یہ اس نے کیا بھی، مگر یہ بات اردو قائدین کو یاد نہ رہی کہ جب ابتدائی سے اعلیٰ ثانوی سطح تک اسکولوں میں اردو تعلیم مہیا نہ رہے گی تو پھر یونیورسٹی سطح پر اردو تعلیم صرف بے وقعتی کا شکار ہوگی۔

اردو سیاست کے خودنگرانہ اور فریب خوردہ مطالبوں کو تو کامیابی مل ہی نہیں سکتی تھی، بات گفت وشنید سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اس کے بعد یہ مطالبہ ہوا کہ ''اردو کو روزی روٹی سے جوڑا جائے۔'' اس مطالبے کی لفظیات یعنی اردو کو حصول معیشت کا ذریعہ بنانے کی خواہش، اور اس کے لیے ''روزی روٹی'' کا فقرہ گڑھنا اور پھر ''وابستہ کرنا'' کی جگہ ''جوڑنا'' کہنا، ان فقروں سے ایک بدحالی اور گداگری کا احساس تو پیدا ہوتا ہی ہے، لیکن ساتھ ہی یہ فقرہ نہایت بھونڈا اور بے قاعدہ بھی ہے ــــ اردو قیادت کے مطالبوں کی طرح۔

اردو کے متعلق مطالبات کے پیچھے جو مقاصد کارفرما ہیں وہ بے شک بالکل جائز اور سچے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اب تک جس طرح مطالبات کیے گئے کیا ان کی تکمیل، اور اگر تکمیل ہو بھی گئی، تو کیا اس کے ذریعے اردو کے مقصود کو کامیابی ممکن تھی؟ ان مطالبات سے ایک خاص مقصد، جو بظاہر ان مقاصد میں شامل نہیں ہے، تو حاصل ہوتا رہا کہ اردو کے لیے عملی اقدامات کی منزل کو اردو قیادت کسی نامعلوم مستقبل میں ڈھکیلتی رہی۔ بے سر پیر کے یہ مطالبات دراصل بے عملی کو ایک حسین جواز فراہم کرتے تھے۔ اردو کے متعلق اردو قیادت کے تمام مطالبات میں اقدام عملی کی تمام ذمے داری حکومت پر ڈال کر ہم اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیتے ہیں کہ حکومت سے مطالبات کرکے ہم اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوگئے ہیں۔

''روزی روٹی'' سے ''جوڑنے والا'' مطالبہ تو بے عملی کا اور بھی بڑا بہانہ ہے، کیوں کہ یہ مکمل طور پر ابہام کا شکار ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی بھی موقعے پر اس مطالبے کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی۔

اول تو یہ سوال ہے کہ آخر اردو کو روزگار سے وابستہ کرنے کے معنی کیا ہیں؟ زبانیں روزگار سے ازخود بازار کی ضرورت کے مطابق وابستہ یا منفک ہوتی ہیں۔ سیاسی مطالبے اس میں کوئی کردار نہیں ادا کرسکتے۔ ویسے ہندوستان میں ایک بھی علاقائی زبان ایسی نہیں ہے جو اعلیٰ تعلیم، یعنی بجائے خود اچھے اسباب معیشت کی زبان ہو۔ آپ یہاں انگریزی کی تعلیم کے بغیر انجینئر، کمپیوٹر ماہر، بینک یا کمپنی منیجر، ڈاکٹر یا کسی بھی قسم کے عملی ماہر نہیں بن سکتے۔ اگر آپ اپنے ملک میں کسی معقول ملازمت کے خواہاں ہیں تو مادری زبان کے ذریعے اعلیٰ تعلیم آپ کا کسی طرح ساتھ نہ دے سکے گی۔ یہ صحیح ہے کہ اب کچھ بہت اچھے اسکول جو انگریزی ذریعۂ تعلیم کے بڑے معیاری اسکول ہیں، نچلے درجات میں (بالعموم پانچویں درجے تک) ہندی یا علاقائی زبان میں تعلیم دیتے ہیں۔ یہ بڑی مبارک بات ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ جو بچے انگریزی ذریعۂ تعلیم سے پڑھنے والوں کی صف میں پہلی دفعہ شامل ہورہے ہیں وہ ابتدائی درجات میں احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ جہاں تک اسی طرز پر انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں ابتدائی درجات میں اردو میں تعلیم دینے کا سوال ہے تو اردو والوں نے کبھی وہ تیاری کی ہی نہیں جو ان اسکولوں میں ہندی اور علاقائی زبانوں میں تعلیم دینے کے لیے کی تھی۔ ویسے اردو والوں کے پاس انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اچھے اسکول ہیں بھی کہاں جہاں اردو مادری زبان کے طور پر یا زبان اول ہی کی حیثیت سے، پڑھائی جاسکے۔ نصاب سازی کے معاملے میں اردو والے اس درجہ پیچھے ہیں کہ اردو ذریعۂ تعلیم کا دستیاب نصاب اکثر صورتوں میں طلبہ میں آگے پڑھنے کی صلاحیتوں کو سلب کردیتا ہے۔

ہمارے ملک میں ایسا تہذیبی ماحول بھی تیزی سے وجود میں آرہا ہے جس میں چھوٹی چھوٹی نوکریوں کے لیے بھی اچھی انگریزی جاننا لازمی ہوگیا ہے اور اب جیسا کہ نظر آرہا ہے، کثیر قومی کمپنیوں نے سستی اجرت دے کر برآمد ملازمت (Outsourcing) شروع کردی ہے۔ وہ ہمارے ان نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کو جنھوں نے انگریزی کے ذریعہ خاصی مہنگی تعلیم حاصل کی ہے، امریکی یا برطانوی لہجے میں بامحاورہ انگریزی بولنے کی تھوڑی سی تربیت دیتی ہیں اور پھر نہایت معمولی تنخواہ پر ہندوستان کے کسی شہر میں ملازم رکھ لیتی ہیں۔ باہر سے جو ٹیلیفون آتے ہیں، ان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم انگلستان یا امریکہ کے کسی شہر میں بیٹھے ہوئے کمپنی ملازم سے بات کررہے ہیں۔ ممکن ہے کہ مابعد سامراج انگریز حاکمیت کے حامی دیگر لوگ انگریزی زبان کی عالم کاری کے اس مظہر پر قومی تفاخر کا احساس کریں لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ رہے گی کہ اس قسم کی برآمد ملازمت کے سبب ہندوستان کی تمام علاقائی زبانیں ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ بڑے خسارے کا شکار ہورہی ہیں۔

اگر نصاب اعلیٰ درجے کا نہ ہو، اور اکثر عمدہ نصاب کے باوجود، علاقائی زبانوں میں تعلیم آپ کو صرف کلرکی یا پھر سرکاری دفاتر میں چھوٹی موٹی نوکری ہی دلواسکتی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ صرف ہندی پڑھ کر کوئی شخص آئی.اے.ایس. یا پھر کسی اچھی منیجرانہ یا ماہر پیشہ ورانہ نوکری میں ہی داخل ہوگیا ہو۔

اردو کو ''روزی روٹی سے جوڑنے'' کے گداگرانہ مطالبے کے ذریعے ہم دراصل یہ خیال پھیلا رہے ہیں کہ اردو بولنے والے صرف معمولی ملازمتوں کے لیے ہی مناسب ہیں (3) اور کسی بہتر ملازمت کے لیے انھیں تعلیم دینا غیر ضروری ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان ریاستوں میں جہاں کی سرکاری اور دیگر

انتظامی اکائیوں کی زبان اردو نہیں بلکہ کوئی دوسری زبان ہے، وہاں علاقائی زبان کے ساتھ اردو کو کوئی مقام دلانے کے لیے جس سیاسی بصیرت کی ضرورت ہے وہ ابھی اردو قیادت کے پاس نہیں۔ مثلاً جنوب کی ریاستوں میں کسی بھی غیر جنوبی، بلکہ کسی بھی دوسرے علاقے کی زبان کے لیے کوئی بھی مطالبہ علاقائی زبانوں کے خلاف محاذ آرائی تصور کیا جاتا ہے۔ 1996 میں بنگلور دوردرشن پر اردو خبریں نشر کرنے کے معاملے پر اٹھنے والا تنازعہ، جس کے نتیجے میں برپا ہونے والے ہولناک فساد میں کئی جانیں بھی گئیں، اردو کے خلاف معاندانہ رویے کا ثبوت ہے۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ غیر اردو علاقوں میں اردو کو اپنی مانگ اس علاقے کی دیگر اقلیتی زبانوں کے ساتھ مل کر پیش کرنا چاہیے۔ بنگلور کی محولہ بالا مثال اس کا ثبوت ہے۔

حقیقی اور تاریخی طور پر جنوب کی زبانیں خطرہ دراصل صرف ہندی سے محسوس کرتی ہیں۔ جب 1965 میں ہندی کو آئین میں مستقل طور پر ''مرکزی حکومت کی زبان'' کے طور پر شامل کرنے کا معاملہ اٹھا تو جنوب، خصوصاً تمل ناڈو میں تقریباً پانچ سو نوجوان خودسوزی اور فسادات کا شکار ہوگئے۔ جنوبی ہند میں اردو کو دوسری زبان بنانے کے مطالبات کا مطلب ہے کہ وہاں تمام ملازموں کے لیے ذولسانیت لازمی ہوگی، یعنی ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ علاقائی زبان کے ساتھ ساتھ اردو سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ اور یہ بات فطری طور پر بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے۔

اترپردیش میں 1989 میں کاغذ پر اردو سرکاری زبان قرار دی جاچکی ہے۔ اس مراعات نے اردو والوں کو صرف اتنا ہی فائدہ پہنچایا ہے کہ اب وہ اصولاً (عملاً نہیں) سرکاری دفتروں میں درخواستیں اردو میں بھی دے سکتے ہیں۔ وہاں تمام ضلع دفاتر میں ایک یا ایک سے زیادہ مترجم اس مقصد سے رکھے گئے ہیں کہ اگر کبھی کوئی درخواست اردو میں موصول ہوجائے تو وہ اس کا ہندی میں ترجمہ تیار کرسکیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، یو. پی. میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو کسی ضلع دفتر میں اردو میں درخواست بھیجتا ہو۔ یہ خدشہ ہمیشہ موجود رہتا ہے کہ درخواست پر مناسب توجہ نہیں دی جائے گی یا پھر ہندی میں ان کا درست ترجمہ نہ ہوسکے گا۔ نوکر شاہی کے عفریت نے بڑے مزے سے ان چند کلرکوں کو نگل لیا ہے جن کا تقرر اترپردیش کے ضلع آفسوں میں اردو مترجمین کے طور پر ہوا تھا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے، ابتدا میں بھرتیاں ہوئی تھیں اور اس کے بعد ایک بھی تقرر عمل میں نہیں آیا ہے اور بطور مترجم جن لوگوں کا تقرر ہوا بھی تھا وہ ترجمے کے بجائے اب کوئی اور ہی کام کررہے ہیں۔

اردو کو حصول معیشت سے منسلک کرنے کا تصور، تخیل کی فلاکت اور عملی فہم کے قحط سے عبارت ہے۔ افسوس کہ ہندوستان کے اردو عمائدین کا مخصوص وصف یہی رہا ہے۔ لگتا ہے کہ انھیں پورا یقین ہے کہ روزگار کے مسئلے کو بالتصریح اردو کے ساتھ وابستہ کرکے حل کیا جاسکتا ہے کہ اس طرح ہر اس شخص کو جو اردو جانتا ہے، روزگار از خود مل جائے گا۔ یہ خیال منطقی طور پر صریحاً غلط ہے اور عملی اعتبار سے اس کا عمل میں آنا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ خیال منطقی طور پر صریحاً غلط ہے اور عملی اعتبار سے اس کا عمل میں آنا ممکن ہی نہیں ہے۔ بالفرض ہم اس کو درست مان بھی لیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوگا کہ ملازمتوں کے دروازے صرف مسلمانوں کے لیے وا ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اردو کی اہلیت رکھنے والا ہر شخص اردو سے مخصوص ملازمتوں کو حاصل کرنے کا حق دار ہوگا۔ اس شخص کے لیے مسلمان ہونا ہرگز لازمی شرط نہیں ہوسکتا، اور چونکہ غیر مسلم اکثریت میں ہیں اس لیے ان مخصوص ملازمتوں کے لیے مقابلہ کم ہونے کے بجائے بڑھ جائے گا۔

حکومت سے مطالبات کی حکمت عملی ہمارے شعور میں کچھ اس طرح گھر کرگئی ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ ان مطالبات کو ارباب اقتدار کے سامنے پیش کرنے اور مناسب طریقہ تجویز کرنے کے بھی اہل نہیں رہ گئے۔ ستم تو یہ ہے کہ اس بارے میں سوچتے بھی نہیں ہیں۔

جب راؤز ایونیو (نئی دہلی) میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی نئی عمارت ''اردو گھر'' بن کر تیار ہوئی تو اس کے افتتاح کے لیے اس وقت کے وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی کو مدعو کیا گیا تھا۔ وزیر اعظم کی افتتاحی تقریر سے پہلے جن لوگوں نے بھی جلسے میں خطاب کیا، ان سب نے آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے خلاف روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کا بڑے جذباتی انداز میں ذکر کرتے ہوئے غم و غصے کا اظہار کیا تھا۔ مرارجی ڈیسائی نے اپنا خطاب ان الفاظ کے ساتھ شروع کیا کہ میرا خیال تھا مجھے ایک عمارت کے افتتاح کے لیے بلایا گیا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھے شکایتوں کی ایک طولانی داستان سننی ہوگی تو میں ہرگز یہاں نہ آتا۔ مرارجی ڈیسائی نے اردو کے فروغ کے لیے کسی بھی قسم کا وعدہ نہیں کیا بلکہ یہ تک کہہ ڈالا کہ اردو کو اپنے ماضی کا لبادہ اتار دینا چاہیے۔ ان کے خیال میں جس کا مطلب یہ تھا کہ اردو کا جھکاؤ فارسی اور عربی کی طرف زیادہ ہے اور یہ ان کے خیال میں نامناسب تھا۔

حال میں اردو کے رسالوں میں مجھے اردو کے بارے میں دو مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوا جن کے عنوانات کچھ اس قسم کے تھے: ''اردو کے مسائل اور ان کا حل''۔ دونوں ہی مضامین میں مفصل طور پر وہ اقدامات گنوائے گئے تھے جن کے ذریعے اردو کے ''مسائل'' کو ''حل'' کیا جاسکتا تھا۔ ان تمام تجاویز میں کوئی کمی نہ تھی، لیکن یہ تمام کے تمام اقدامات حکومت کے کرنے کے

تھے، اردو والوں پر کسی قسم کی ذمے داری نہیں ڈالی گئی تھی۔ ان مضامین کے لکھنے والے گویا بالواسطہ یہ کہہ رہے تھے کہ اردو معاشرے پر اس ضمن میں اس کے علاوہ کوئی فرض نہیں عائد ہوتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ ایسے مضامین تحریر کریں جن میں حکومت کو ہدایت دی جائے کہ اردو کے حالات کی بہتری کے لیے اسے کیا کیا کرنا چاہیے۔

ایک زمانے میں اردو سیاست کے نام پر گجرال کمیٹی کی رپورٹ بڑے زور شور سے تیار کی گئی تھی۔ یہ صرف ان معنوں میں ایک دستاویز ہے کہ یہ بڑی ضخیم ہے۔ اس کی ضخامت ہی اس بات کی ضمانت تھی کہ یہ کبھی نافذ نہ ہوسکے گی۔ اسی لیے شاید اردو قیادت نے اسے پڑھا بھی نہیں۔ ایک طرح سے مذکورہ مضامین بھی گجرال کمیٹی رپورٹ کی مانند ہیں کہ ان میں بھی یہ تو بتایا گیا ہے کہ اردو کے لیے کیا کیا اقدام کیے جائیں۔ لیکن یہ تجویز نہیں کیا گیا کہ مجوزہ اقدام کس طرح کیے جائیں۔

گجرال کمیٹی کی سفارشات کے ذریعے اردو والوں کو یہ کہہ کر بے وقوف بنایا گیا تھا کہ مرکزی حکومت انھیں نافذ کرے گی لیکن یہ کہیں نہیں بتایا گیا تھا کہ مرکزی حکومت کے کس ادارے کی نگہداشت اور نگرانی میں ان کا نفاذ ہوگا۔ یہاں میں اس بات کو پھر دہراؤں گا کہ مرکزی حکومت، ریاستوں کی مرضی کے بغیر کسی زبان کی ترقی کے لیے کچھ نہیں کرسکتی کیوں کہ آئینی طور پر تعلیم کے معاملے میں مرکزی حکومت کے اختیارات محدود ہیں۔ اردو کی معصوم قیادت کو یہ سامنے کی بات بھی یاد نہ آئی کہ اردو مرکزی حکومت کی زبان نہیں ہے اور مرکزی حکومت صرف ہندی اور انگریزی کے فروغ کے لیے اقدام کرنے کی مجاز ہے۔ آئین ہند کے مطابق ہندی کی حیثیت Official Language of the Union کی ہے جب کہ انگریزی Additional Associate Language of the Union ہے۔ (یہاں یہ وضاحت شاید ضروری ہو کہ آئین ہند میں کسی ''قومی زبان'' یعنی ''راشٹر بھاشا'' کا ذکر نہیں ہے۔)

مذکورہ بالا مضامین کے مصنفین کو بھی شاید یہ یقین تھا کہ وہ بھی چھوٹے پیمانے کی گجرال کمیٹی رپورٹ لکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کے احیا اور اس کی ترقی سے متعلق بے سرپیر کے مضمون لکھنے کے معاملے میں اردو اہل قلم کا معاملہ گجرال کمیٹی کے اراکین جیسا ہی ہوتا ہے۔

تاریخ نے ہمیں جو سبق نہیں سکھایا ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی بھی اقلیتی فرقہ اگر اپنے آپ میں اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ایک اہم سیاسی حلقے کی تشکیل کرلے تو پھر اسے حکومت سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ حکومت سے اپنے حق میں کام کرالے گا۔ اقلیتوں کو تعلیم کی فراہمی خصوصاً ان کی اپنی زبان میں فراہمی کے معاملے میں عالم گیر پیمانے پر ہر ملک میں بے بسی کا عالم ہے۔ دراصل ناخواندہ اقلیتوں ہی سے سستے مزدور فراہم ہوتے ہیں اور تجار اور صنعت کار کبھی نہ چاہیں گے کہ وہ سستے مزدوروں کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے جانے دیں۔ دوسری جانب، کیوں کہ تقریباً سبھی جگہوں کی اقلیتوں کو چونکہ آئینی مقدریت حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کا تنظیمی ڈھانچا ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر کرسکیں، اس لیے لازماً حکومت سے امید وابستہ کرلی جاتی ہے کہ وہ ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔

ہندوستان میں اردوداں آبادی کی اکثریت پسماندہ ہے اور وہ اپنے بچوں کے لیے علاحدہ سے پرائیویٹ اور مہنگے اسکولوں کا نظم نہیں کرسکتے۔ اس لیے بجا طور پر وہ حکومت سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ان کے بچوں کے لیے دیگر اہل ملک کی طرح تعلیم کا نظم کرے۔ آئین کی 86 ویں ترمیم کے بعد اب یہ ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ 6 سے 14 برس تک کے بچوں کی لازمی تعلیم کا انتظام کرے۔ ریاستی حکومتیں اس تعلیم کا نظم اپنی ریاست کے باشندوں کے لیے ان کی مادری زبانوں میں کریں گی، انگریزی میں ہرگز نہیں۔ اس لیے اردو والوں کو یہ مطالبہ منظم طریقے سے کرنا چاہیے کہ ان کے بھی بچوں کی تعلیم کے لیے آئین کی 86 ویں ترمیم کے تحت اسکول کھولے جائیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حکومت کی بے عملی کا مقابلہ ہم خود بھی بے عملی سے کریں، اور اگر حکومت کچھ نہ کرے تو ہم بھی کچھ نہ کریں۔ گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک اور ایک حد تک آندھرا پردیش کے اردو حلقوں نے حکومت کی بے عملی کا جواب اپنی بے عملی سے نہیں، بلکہ عملی کاموں کے ذریعے دیا ہے۔

گجرال کمیٹی رپورٹ نے اردو والوں کو جس طرح بے وقوف بنایا اس کی کوئی اور مثال مشکل سے ملے گی۔ اس پوری رپورٹ میں ایک بھی ایسی کی بات نہیں ہے جو اردو کے احیا میں عملی طور پر معاون ہو۔ یہ رپورٹ شمالی ہند میں اردو کو آئینی حیثیت دینے کے کسی مطالبے کو تسلیم نہیں کرتی۔ دوسری سرکاری زبان کی آئینی حیثیت کا اس رپورٹ میں کوئی ذکر نہیں۔

میں اردو کو مناسب علاقوں میں دوسری سرکاری زبان بنانے کا ہرگز مخالف نہیں۔ میں اس بات کی پرزور حمایت کرتا ہوں کہ اردو کو سرکاری زبان کی آئینی حیثیت ملنی چاہیے۔ مگر میرا کہنا یہ بھی ہے کہ اسکول کی سطح پر اردو تعلیم کی عدم دستیابی نے اردو کو جہاں پہنچا دیا ہے وہاں اب اسے دوسری سرکاری زبان بن جانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اردو کا احیا اسکول کی تعلیم کے ذریعے نہ ہوجائے۔ گجرال کمیٹی رپورٹ میں صفحات کے صفحات آئین کے ذکر میں سیاہ کیے گئے ہیں مگر مرکزی حکومت کے زیر اہتمام تشکیل شدہ یہ رپورٹ اصولاً اردو کے لیے دوسری سرکاری زبان کے درجے کی سفارش نہیں

کرتی۔ یعنی وہ اردو کے اس آئینی حق کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شمالی ہند کی ریاستوں میں واحد سرکاری زبان ہندی ہونی چاہیے۔ گویا یہ رپورٹ بھی صرف ہندی کی آئینی حیثیت کو تسلیم کرتی ہے۔ گجرال کمیٹی رپورٹ میں سہ لسانی فارمولے کے مطابق زبان اول کے طور پر اردو مادری زبان والے بچوں کے لیے اردو کی پڑھائی کی کہیں سفارش نہیں کی گئی ہے۔ اگر یہ رپورٹ طول طویل بحثوں اور ضمنی سفارشات کرنے کے بجائے صرف یہی ایک سفارش کر دیتی تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ مرکزی حکومت کے زیر انتظام کیندریہ ودیالیہ مرکزی حکومت کے برسرکار ملازمین کے بچوں کی تعلیم کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ گجرال کمیٹی نے آئین کی دفعہ 350 الف کا بار بار حوالہ دیا جو بچوں کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دینے کی ضامن ہے، مگر رپورٹ میں کہیں بھی کیندریہ ودیالیوں میں اردو مادری زبان والے بچوں کو ابتدائی تعلیم اردو میں دینے کی بات نہیں کہی گئی ہے۔ میں نے کبھی کسی اردو والے کو یہ مطالبہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا، حالانکہ یہ کیندریہ ودیالیوں میں پڑھنے والے بچوں کا آئینی حق ہے۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو تاریخ کا سب سے افسوس ناک باب یہ ہے کہ جب خود اندرکمار گجرال وزیر اعظم تھے تو انھیں بھی اردو کا نام لینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ گجرال کمیٹی رپورٹ کی تو بات ہی چھوڑ دیجیے۔ اندرکمار گجرال اگر اپنے دور میں اردو کے فروغ کے لیے کچھ کرنا چاہتے تو حالات بہتر ہو سکتے تھے (4) بحیثیت وزیر اعظم اندرکمار گجرال اگر وزرائے اعلیٰ کو خط لکھ کر گجرال کمیٹی کی سفارشات کے نفاذ کی درخواست کرتے تو ریاستی سطح پر گجرال کمیٹی کی سفارشات کا کسی حد تک نفاذ ممکن تھا۔ اور کچھ نہیں تو ریاستی نوکرشاہی کچھ روز کے لیے اردو دشمنی سے باز آجاتی۔ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ گجرال کمیٹی کے نام پر سیاست کرنے والی مفاد پرست قیادت نے گجرال صاحب پر اپنی رپورٹ کے نفاذ کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔

دینی مدارس کا نظام مسلمانوں کا اپنا وضع کردہ نظام ہے۔ اس میں جدید کاری کا فیصلہ بھی مسلمان خود کریں گے۔ دینی مدارس میں تبدیلی کی ضرورت سے مسلمان یقیناً غافل نہ ہوں گے، مگر مسلمانوں کے اقتصادی حالات جس درجہ خراب ہیں ان میں دینی مدارس کو حکومت کے ذریعے جدید تعلیمی اداروں کی طرز پر ازسرنو تشکیل دینے کا مشورہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے روٹی موجود نہ ہونے کی صورت میں کیک کھانے کا مشورہ دینا۔ اردو اور مسلم رہنماؤں کو وہ حقائق بھی نظر نہیں آتے جو ہمارے سامنے ہیں۔ ایک مدرسے کی امداد ہوگی اور فرقۂ مخالف کے دس پانچ شالاؤں کی۔

ہندوستان میں اردو اور مسلمانوں کے معاملات اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں جتنے کہ دوسرے ممالک میں لسانی اور مذہبی اقلیتوں کے معاملات ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اقلیتی فرقہ ملک کی تقسیم کے بعد اپنی کوئی شناخت طے کرنے میں خود ہی ناکام رہا ہے۔ گذشتہ صدی کے نصف اول میں مسلمان اس خیال کے تھے، یا انھیں یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اردو بنیادی طور پر مسلمانوں کی زبان ہے۔ ملک کی تقسیم زبان کی بنیاد پر ہرگز عمل میں نہیں آئی تھی لیکن ہندوستان میں یہ احساس پیدا کر دیا گیا تھا کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور اردو والوں نے پاکستان لے لیا ہے، اس لیے اب ہندوستان میں اردو کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے یا نہیں ہونی چاہیے۔

مسلمانوں کا یہ موقف کہ اردو صرف ان کی زبان ہے، جلد ہی غلط اور باطل ثابت ہو گیا۔ پھر بڑے بڑے اعلان اس نوعیت کے کیے گئے کہ اردو ہندوستانی زبان ہے، یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے اور یہ کہ آزادی کی جدوجہد میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، وغیرہ۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اردو کی ''غیر ملکی جڑوں''، ''غیر ملکی رسم خط''، ''غیر ملکی ادبی تہذیب'' اور اس کی ''اسلامی مذہبی شناخت'' وغیرہ جیسی باتیں اب بھی مسلسل سنائی دیتی ہیں۔ اور جو لوگ اردو کے حامی ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں وہ اتنا ہی کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ اردو بڑی عمدہ زبان ہے۔ اس نے جنگ آزادی میں ہمیں ''انقلاب زندہ باد'' جیسا نعرہ دیا۔

الٰہ آباد، وہ شہر جہاں میں رہتا ہوں، ایک طویل عرصے سے ہندی ادب کے ایک بڑے مرکز کے طور پر مشہور ہے، یعنی ہندی کی سیاست کا بھی یہ اہم شہر ہے۔ یہ ایسا شہر بھی ہے جس نے ہندی زبان کے ارتقا اور جدید ہندوستانی زبان کے طور پر ہندی کے قائم ہونے میں تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

الٰہ آباد میں کئی اہم دعوے ہندی کی حیثیت کے باب میں کیے گئے ہیں: مثلاً یہ عام لوگوں کی زبان ہے، ایسی زبان، جسے ہندوستانی بھی کہا جا سکتا تھا: ہندی صرف ہندوؤں کی زبان ہے؛ یہی ایسی زبان ہے جس کے ذریعے ہندوستان کی فطرت، اس کے باطن کا صحیح اور مثالی اظہار ہو سکتا ہے (یعنی ہندی= ہندو= ہندوستان) وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام سوال الٰہ آباد کے ہندی ادبی اشراف نے گذشتہ صدی کے ربع اول میں اٹھائے اور ان پر بحث کی۔ بعد کے ادوار میں بھی ان موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ وہ گریز پا مخلوق جسے ''ہندی کا عام آدمی'' کہا جا سکتا ہے، اس کے نقطۂ نظر کو جدید ہندی کی سیاسی مقاصد سے کی جانے والی تشکیل کے مباحث میں کوئی جگہ نہیں ملی۔ جدید ہندی کی تشکیل کے نظریہ سازوں کے سامنے ایک بڑا لیکن غیر واضح اور غیر مربوط مسئلہ ایک ایسے لسانی تشخص کی تشکیل کا تھا جسے اسی طرح ''ہندو'' کہا جا سکے جس طرح ان کے خیال میں ایک مفروضہ ''مسلم''

تشخص موجود تھا، (اصل مفروضہ یہ تھا کہ اردو زبان دراصل ''مسلم'' لسانی تشخص کی مجسم علامت ہے)۔ جدید ہندی کی تشکیل کا مقصد اس مفروضہ مسلم تشخص کی ہوا پیدا کرکے ایک ایسا ہندو تشخص پیدا کرنا تھا جو فسطائی سیاست کا آلۂ کار بن گئی۔ اسی سیاسی جدید ہندی کو میں ''بالفعل زبان'' کہتا ہوں۔ کسی بھی لسانی نظریے کی رو سے جدید ہندی اردو سے الگ کوئی زبان نہیں ہے۔

اس صورت حال میں کوئی بھی شخص یہ گمان کرسکتا ہے کہ ان حالات کا قدرتی انجام یہ ہوا ہوگا کہ انھیں فرقہ وارانہ خطوط پر اردو= مسلم لسانی تشخص کے تصور میں استحکام عمل میں آیا ہوگا اور شدت پیدا ہوئی ہوگی۔ اور اردو اشراف نے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اردو زبان کے فارسی، عربی ''اسلامی'' کردار پر زور ڈالنے میں جارحانہ رویہ اختیار کیا ہوگا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اسی دور میں اکبرالہٰ آبادی اردو میں ایسی شاعری کررہے تھے جن میں انگریزی کے الفاظ طنز و مزاح کی کیفیت پیدا کرنے کے مقصد سے استعمال کیے جارہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی، انھوں نے ادبی اردو میں دخیل عربی فارسی الفاظ، یا نام نہاد ''بلند'' (High) اردو سے بھی اجتناب کیا۔ اس وقت بہت سے مسلمان ایمانداری سے یہ یقین رکھتے تھے کہ اردو کی کوئی مذہبی شناخت نہیں ہے، لیکن اس کے بہترین ادیب یا تو مسلمان تھے یا مسلمانوں جیسے تھے۔ اردو کے ادبی حلقوں کے علمی تصورات میں اس مفروضے نے اس قدر گہری جڑ پکڑی کہ فراق گورکھ پوری کو، جو خود ہندو تھے، 1945 میں ایک مضمون لکھنا پڑا جس میں انھوں نے لکھا کہ اردو زبان ہندوؤں کے مقابلے میں قدرتی طور پر مسلمانوں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

یہاں علامہ شبلی کا وہ بیان ذہن میں لے آنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بہت سے ہندو، مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر اردو لکھنا جانتے ہیں، حالانکہ اردو مسلمانوں کی قومی زبان ہے۔ مقتدر اردو ادیبوں کے ایسے اعلانات کے سبب اردو کے مخالفین کے لیے یہ کہنا مشکل نہیں رہ گیا کہ اردو ایک ''مسلم'' زبان ہے جس کے بین السطور میں یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی طرح یہ بھی ایک غیر ملکی زبان ہے۔ سچائی تو یہ ہے کہ آر.ایس.ایس. ذہنیت کے ہندو قوم پرست آزادی کے بعد کے ماحول میں اردو کے حق میں سب سے بڑی رعایت صرف یہی کرسکتے تھے کہ اردو والوں کے قتل کا فرمان تو جاری نہ کریں مگر اردو والے ان سے یہ توقع بھی نہ کریں کہ وہ اردو کے آزاد وجود کو تسلیم کرلیں گے۔ آر.ایس.ایس. سے یہ توقع فضول تھی اور ہے کہ وہ اس کے سوا اور کچھ کہے گا کہ اردو کچھ نہیں ہے، ہندی کی صرف ایک ''شیلی'' ہے۔ مسلمان، یا پھر اردو والے سامنے کی یہ بات بھی عموماً نہ کہہ سکے کہ چونکہ کھڑی بولی کا خاص اور بنیادی تعلق اردو سے ہے، برج بھاشا اور اودھی جیسی زبانوں سے نہیں جو آئین ہند کے ذریعے پوری دیدہ دلیری کے ساتھ ہندی کی شیلی کے طور پر ہندی ہی میں ضم کردی گئیں، لہٰذا کھڑی بولی ہندی یعنی وہ جدید زبان جس کو آج ہندی کہا جاتا ہے، اردو کی ایک شیلی ہے۔ اس لسانی حقیقت کو اس لیے فراموش کردیا گیا کہ اردو والوں میں اس حقیقت کے اظہار کا حوصلہ نہیں تھا۔

تاریخی حقائق خواہ کچھ بھی ہوں، یہ بات اب ایک حقیقت بن چکی ہے کہ آج اردو بولنے والوں کی غالب اکثریت، یا اردو کو اپنی مادری زبان کہنے والوں کی اکثریت کم و بیش سو فی صدی مسلمان ہے لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ اس زبان سے محبت کرنے والے غیر مسلم حضرات بھی بہت سے ہیں اور ان کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہورہا ہے۔ میں ایسے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے نام گنوا سکتا ہوں جو ہندو ہیں اور جنھوں نے بڑے ہوکر اردو سیکھی، اور یہ زبان انھوں نے اس لیے سیکھی کہ وہ یا تو اردو شاعری یا اردو سے وابستہ تہذیب کے شیدائی تھے یا اس زبان کے کسی ایسے پہلو کے عاشق جو شاید ان کی اپنی زبانوں میں مفقود تھا۔ اسی طرح ایسے غیر مسلم لوگ بھی خاصی بڑی تعداد میں ہیں جو مراسلاتی کورسوں کے ذریعے یا پھر شام کی کلاسوں میں غیر رسمی طور پر اردو سیکھتے ہیں۔

متذکرہ بالا دونوں شقوں کے لوگ ہندوستان کے ہر خطے سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں یو.پی. اور بہار وغیرہ کے علاوہ بھی ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جو گجراتی، مراٹھی، پارسی، عیسائی وغیرہ ہیں لیکن اردو کے عاشق ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس صورت حال کے برخلاف میں ایسی کوئی حالیہ مثال نہ دے سکوں گا جس میں یہ ہوا ہو کہ ہندو والدین نے اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے پہلی، دوسری یا تیسری ہی زبان کے طور پر اردو کی تعلیم دلائی ہو۔ اس باعث ہمیں یہ قبول کرکے چلنا چاہیے کہ ہندوستان میں اردو کی باقاعدہ تعلیم کا مسئلہ اقلیت کے مسئلے کے طور پر ہی سمجھا اور طے کیا جائے گا۔

سوال یہ ہے کہ اردو تعلیم کی موجودہ عبرت ناک صورت حال ہمیں کدھر لے جائے گی؟ کیا ایسے شخص کو فرقہ پرست، تنگ نظر، یا نام نہاد ''قومی غدار'' تصور نہیں کیا جائے گا جو اردو اور اردو تعلیم کے سوال کو مسلم تعلیم کے ایک زاویے کے طور پر سمجھنا اور اس پر گفتگو کرنا چاہتا ہے؟ لیکن اگر حقیقت پسندی کی قیمت ایسے الزامات سر لے کر ادا کرنی پڑتی ہے تو بھی یہ کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ تبدیل ہوتی ہوئی سیاسی فضا اردو کی ترویج کا گوشوارۂ عمل ماضی سے مختلف اور حقیقت پر مبنی امیدوں پر مرتب کرے گی۔ دائیں بازو اور فسطائی قوتوں کی موجودہ دور میں مضبوطی اپنی جگہ، لیکن اس بات کو اب عموماً تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ (صرف ان لوگوں کو چھوڑ کر جو دائیں بازو میں بھی زیادہ کٹر

نظریات کے حامل ہیں) کہ اقلیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ان کے وجود کا انکار نہیں کیا جاسکتا، نہ انھیں اکثریت کے مذہب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایسی کوئی بھی کوشش جس میں اقلیتوں کو بالکل اکثریت کے مانند بنانے کی کوشش کی جائے، نقصان دہ اور پیداوار مخالف (Counter productive) ثابت ہوگی۔

ہم اردو والے یو. پی. اور اترانچل جیسے علاقوں میں اردو کی صورت حال کو سامنے رکھ کر ملک گیر نتائج اخذ کرتے ہیں۔ یو. پی. مع اترانچل میں اردو کی عدم موجودگی کے ذمے دار یا مجرم ہم اردو والے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اردو پورے ملک سے غائب ہوچکی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں جو کام کرنے ہیں ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو کے معاملے میں اتر پردیش کی برتری کے مفروضے کو شکست کردیں۔ یو. پی. والے سمجھتے ہیں کہ اردو اگر ہمارے یہاں نہیں ہے تو کہیں نہیں ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ''معیاری'' اردو کے اجارہ دار ہیں۔ یہ دونوں باتیں بالکل غلط ہیں۔

ایک طویل عرصہ ہوا، میں (اس وقت کے) بہار کے ڈالٹن گنج ضلع میں ایک ایسے علاقے میں سفر کررہا تھا جو گھنے جنگلوں سے پٹا پڑا تھا۔ وہاں میں نے ایک سڑک کے کنارے ایک چھوٹی اور ادھوری بنی ہوئی عمارت دیکھی جس کے اندر کم عمر آوازوں کو سن کر متعجب ہوا۔ وہ اردو کے ابتدائی اسباق زور زور سے پڑھ رہے تھے۔ میں تفصیل معلوم کرنے کے لیے رک گیا تو پتہ چلا کہ یہ مدرسہ گاؤں والوں کی رضاکارانہ کوششوں سے چلتا ہے اور مدرسے کے لیے زمین گرام سبھا نے فراہم کی ہے۔ اس اسکول میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی پڑھ رہے تھے اور اس مکتب کا بنیادی مقصد انھیں قرآن شریف کی تلاوت اور قرأت سکھانا تھا۔

دنیا بھر کی غیر مسلم حکومتوں نے اور خود ہندوستان میں مرکزی حکومت اور صوبائی حکومتوں نے اب مدرسوں کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھنی شروع کردی ہے اور گیارہ ستمبر 2001 کے واقعات کے بعد مدرسوں کی سماجیات ہی بدل گئی ہے۔ اس بات کے باوجود ہم اردو کے لیے مدرسوں کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتے۔ آج اگر اتر پردیش اور بہار کے دیہی علاقوں میں اردو نے اپنے وجود کو قائم رکھا ہے تو اس کی بڑی وجہ یہی دینی تعلیم کونسل ہے۔ لیکن اتر پردیش کے شہری علاقوں میں جہاں مسلم سیاست کی سمت متعین کرنے والی قوتیں مرکوز ہیں، صورت حال بہار کے مقابلے میں بالکل دوسری ہے۔ مثال کے طور پر الٰہ آباد کے متصل علاقوں کی آبادی کا خاصا بڑا حصہ مسلم آبادی پر مشتمل تو ہے مگر اردو سے بے بہرہ۔ ماضی قریب میں ایک دن میں نے کسی پتے کی تلاش میں الٰہ آباد میں ایک مسلم آبادی کا تقریباً سارا علاقہ چھان مارا مگر بازاری علاقوں میں بھی کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں ایک بھی سائن بورڈ اردو میں لگا ہوا ہو۔

لکھنؤ میں بھی صورت حال اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ چند برس قبل تک حضرت گنج میں، جہاں اعلیٰ طبقے کا بازار ہے، ایک دکان کا سائن بورڈ اردو میں نظر آتا تھا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ یہ بورڈ جو بڑے خوبصورت خط میں لکھا ہوا تھا کسی ہندو دکاندار کا تھا۔ لیکن ایک دن یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوا کہ اردو کا بورڈ وہاں سے ہٹالیا گیا ہے۔ اس کا سبب جاننے کے لیے میں دکاندار کے پاس گیا تو اس نے کچھ مبہم سا جواب دیا اور مجھے ایسا لگا کہ وہ صحیح جواب دینے سے کترا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ بورڈ مرمت کے لیے گیا ہے اور جلد ہی دوبارہ لگا دیا جائے گا۔ میں کئی دن تک بلاوجہ ہی اس بورڈ کو پھر سے لگا ہوا دیکھنے کی امید کرتا رہا لیکن یہ دوبارہ کبھی نہیں لگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب اردو کے خلاف تعصب نہیں بلکہ یہ سماجیات ہوگی کہ اس دکاندار کے بیشتر گاہک اردو کا بورڈ نہیں پڑھ سکتے۔

تقریباً گذشتہ پچاس برس سے میری بیوی الٰہ آباد میں لڑکیوں کی تعلیم کے میدان میں کام کررہی ہیں۔ دو انٹرمیڈیٹ کالجوں کی صورت میں کل وقتی تعلیمی اداروں کے علاوہ اردو تدریس کے مرکز بھی چلاتی ہیں۔ کل وقتی اسکولوں میں انھوں نے اردو کو اپنی مادری زبان قرار دینے والی لڑکیوں کے لیے اردو کی لازمی تعلیم کا انتظام ہمیشہ کیا۔ ابتدا میں میری بیوی کو طالب علموں کی طرف سے نہیں، بلکہ ان کے والدین کی طرف سے مخالفت برداشت کرنی پڑی، جو ظاہر ہے کہ مسلمان تھے۔ لیکن بتدریج یہ ہوا کہ طلبہ کے والدین کو یہ احساس ہونے لگا کہ اردو کی تعلیم کا موجود ہونا ہی اپنے آپ میں اہم اور قیمتی تحفہ ہے۔ لیکن ان اداروں کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دونوں کالجوں میں تعلیم کا معیار بلند ہے اور سیکنڈری بورڈ کے امتحانوں میں کامیاب ہونے والی ہندو مسلمان طالبات کا تناسب یکساں طور پر بلند رہتا ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ میری اہلیہ اس وجہ سے اردو مادری زبان والے والدین کو اس بات کے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہوسکیں کہ ان کے بچوں کو بھی ایک اختیاری مضمون کے طور پر اردو کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ ان کے اسکولوں میں عمومی ماحول اور تعلیم کا معیار بہت اچھا تھا۔ اس لیے میں اس پر اصرار کرتا ہوں کہ جب تک نصاب سازی سے لے کر دیگر تمام متعلقہ شعبوں پر توجہ نہ دی جائے گی اسکولوں کی سطح پر اردو تعلیم کی کوششوں کو کامیابی ملنا مشکل ہے۔

میرا خیال ہے کہ جو اسکول اردو کی تعلیم فراہم کرتے ہیں، اگر ان کی شہرت معیاری اسکول کی ہے تو پھر اردو کو بہ آسانی ایک اختیاری مضمون بنایا

جا سکتا ہے۔ لیکن مشکل یہی ہے کہ ان اسکولوں میں سے جو اچھے اور معیاری کہلاتے ہیں، چند ہی ایسے ہوں گے جہاں اردو کی تعلیم بھی دی جاتی ہو۔ اگر دہلی کے اول درجے کے انگریزی ذریعۂ تعلیم والے اسکول پانچویں اور ساتویں درجے تک ہندی، یا کسی اور علاقائی زبان میں تعلیم دے سکتے ہیں اور ہندی کو پہلی اور لازمی زبان کے طور پر پڑھا سکتے ہیں، تو اس تجربے کو اردو کے لیے بھی آسانی دہرایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اسکول کی سطح پر اردو کی تعلیم کے مسئلے کا حل یہی ہے کہ اردو تعلیم کے تمام اسکول، خواہ وہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکول ہوں یا پھر ایک اختیاری زبان کے طور پر اردو پڑھاتے ہوں، اپنے عمومی معیار کو بلند کریں۔ لیکن کہنا آسان ہے اور کرنا مشکل۔ ہمارے ملک میں اب تک نام نہاد انگریزی اسکولوں کا سکہ چل رہا ہے اور بہت ہی کم ایسے اسکول ان سے مقابلے کی توانائی رکھتے ہیں جو انگریزی میڈیم کے نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کے لیے نجی زمرے (Private sector) کا عروج ہندوستان میں ابتدائی تعلیم کے سرکاری نظام کی ناکارگی کے سبب ہوا۔ ٹیکس دہندہ کے پیسوں سے چلنے والے سرکاری اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم نسبتاً آسان تھا۔ اب قدرے مشکل ہے۔ مجھے اس خیال سے مکمل اتفاق ہے کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم زندگی کی ناگزیر ضرورت بن گیا ہے۔ لہٰذا اردو تعلیم کے احیا کے لیے یہ اہم نکتہ ہے کہ جو بامقدور ہیں ان کے بچوں کے لیے انگریزی اسکولوں میں پانچویں درجے تک تعلیم کا ذریعہ اردو ہوسکتی ہے بشرطیکہ اسکول کی شہرت اعلیٰ پائے کی ہو۔

ایک اور مسئلہ، اگر ہم اسے مسئلہ کہہ سکیں، یہ ہے کہ تمام اعلیٰ معیار کے اسکول مبینہ طور پر اپنے طالب علموں پر حد سے زیادہ کتابوں کا بوجھ ڈالے ہوئے ہیں۔ اردو کے ایک معروف عالم نے مجھ سے کہا کہ ان کا بچہ گھر پر اردو اس لیے نہیں پڑھ سکتا کہ اس کا اسکول کا کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ وہ ہفتے کے ساتوں دن مصروف رہتا ہے۔ یہ جواز مجھے اتر پردیش اور بہار میں تقریباً ہر جگہ سننے کو ملا ہے۔ لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ایسے تمام بچے ٹیلی ویژن دیکھنے، کھیلنے، جھگڑنے، سیریں کرنے، اور دوستوں کے ساتھ گلچھپ کے لیے وقت کہاں سے نکالتے ہیں؟ یہ بات صاف محسوس کی جاسکتی ہے کہ وقت کی قلت بچوں کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کے والدین کا ذہنی دیوالیہ پن مسئلہ ہے۔ میرے کہنے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ تمام اردوداں بچوں کے والدین کو اپنے بچوں کی گھر پر اردو تعلیم کے لیے وقت اس وجہ سے نکالنا چاہیے کہ اسکولوں میں اردو تعلیم کا انتظام نہیں۔ بغیر کسی تکلف کے میں اس مطالبے کی حمایت کرتا ہوں کہ اردو تعلیم کا اہتمام اسکولوں میں ہونا ہی چاہیے۔ مگر والدین کو بھی اپنے بچے کو اردو نہ پڑھانے کے احمقانہ جواز دینے سے گریز کرنا چاہیے اور صاحب حیثیت یا صاحب فرصت والدین کو گھر پر اردو تعلیم کا انتظام بھی کرنا چاہیے۔

اس صورت حال میں ایک متبادل یہ بھی ہوگا کہ اردو بولنے والے اپنے بچوں کے لیے غیر رسمی لیکن سنجیدہ اسکول بھی قائم کریں جو ہفتے کی چھٹیوں میں چلائے جائیں۔ یہ بات درست ہے کہ بہت سے والدین اس قسم کی تعلیم کو فضول سمجھیں گے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر مقامات پر اردوداں آبادی کے اقتصادی حالات جزوقتی اور اضافی تعلیمی مراکز کے قیام کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ممکن ہی ہے۔ آخر یہ لوگ شادی بیاہ، منگنی، ختنہ، عقیقہ، وغیرہ پر بھی تو رقم اڑا دیتے ہیں۔ اور یہ بھی ہے بہار اور مہاراشٹر جیسی ریاستوں میں غیر رسمی تعلیمی ادارے کھولنے کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ پہلے سے موجود اداروں کو مستحکم کرنے کی ہے۔ یہ خیال رہے کہ تمام دنیا میں لسانی اقلیتیں اپنے اسکول کھولتی رہی ہیں اور اس طرح اپنی زبان کو محفوظ کرتی رہی ہیں۔ اردو والوں میں کون سے ایسے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ایسا کرنا ان کے دون مرتبہ ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان اسکولوں میں ایک اہم اختیاری مضمون کے طور پر پہلی اور دوسری زبان کی حیثیت سے اس لیے پڑھائی جانی چاہیے کہ یہ طالب علموں کے ذہنی افق کو وسیع اور صلاحیتوں کو کشادہ کرے گی۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ سہ لسانی فارمولے کا نفاذ مکمل ایمان داری سے ہونا چاہیے اور اردو تعلیم میں موجودہ خامیوں کو دور کیا جانا چاہیے۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اردو والے ''مانگنے'' کے بجائے ''عمل کرنے'' کی سیاست اختیار کریں۔ ہم اردو والوں کا پیکر لسانی سیاست کے میدان میں ٹکڑ گداؤں سے بہتر نہیں رہ گیا ہے۔ ہم تقاضا بہت کرتے ہیں، کرتے کچھ نہیں۔ اب ہمارا لائحۂ عمل ''مانگنا'' نہیں، بلکہ ''عمل کرنا'' ہونا چاہیے۔ جب ہم عمل کریں گے تو حکومت بھی جانے گی کہ ہم سنجیدہ ہیں، صرف لفظی پھلجھڑیاں نہیں چھوڑ رہے ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ غیر رسمی تعلیم کے مرکز کھولنے کے بجاے اردو معاشرے کو چاہیے کہ وہ ایسے کل وقتی رسمی اسکول قائم کرنے کے لیے کوشش کرے جہاں اردو کو بے روک ٹوک پڑھانے کی سہولت فراہم ہو۔ اس کو ہم اپنا آدرش تو بنا سکتے ہیں لیکن مجھے خوف ہے کہ ایسے اسکولوں کی غیر موجودگی کو ہم اپنی بے عملی کا ایک اور بہانہ بنالیں گے۔

گجرات میں مسلمانوں نے ایسے اسکول قائم کیے ہیں جہاں اردو اور گجراتی ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی ہیں اور ان اسکولوں نے اچھے نتائج بھی دیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کرناٹک میں بھی اسی طرح کے اسکول چل رہے ہیں۔ کیا ایسے اسکول اور جگہ نہیں ہوسکتے؟ کیا وجہ ہے کہ اہل اردو اگر اسکول کھولتے

بھی ہیں تو اس میں اردو کو مناسب مقام نہیں دیتے، بلکہ اکثر تو کوئی مقام ہی نہیں دیتے؟ البتہ یہاں ایک احتیاط ضروری ہے۔ اردو معاشرے کو اس بات کا قائل کرنا ضروری ہوگا کہ اسکولوں میں اردو تعلیم کا نظم اس کے بچوں کا آئینی حق ہے اور اس میں اس حق کو حاصل کرنے کی صلاحیت اور اہلیت ہے۔ اردو معاشرے کو اپنے اوپر اعتماد کرنا سیکھنا ہوگا۔ اسے اپنے آپ کو یہ بھی سمجھانا ہوگا کہ غلط نعروں کے ذریعے ووٹوں کی سیاست کرنے والوں پر انحصار سے اردو کے احیا میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اردو کے رضاکار اداروں کو ہر اس مثبت جارحیت کا استعمال کرنا چاہیے جس کا انھیں جمہوری حق آئین نے دیا ہے۔ جمہوریت میں حکومت کی اپنی حدود ہیں۔ وہ چاہے بھی تو ہر کام نہیں کرسکتی۔ اردو داں آبادی کو روایتی مدافعتی رویہ اختیار کرنے کی روش کو اب ترک کردینا چاہیے۔ اردو لسانی اقلیت کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے حق کا مثبت استعمال کرنا سیکھے۔ اردو کی تہذیب اور تاریخ بیش قیمت قومی ورثہ ہیں اور اردو کا زیاں پورے ملک کا زیاں ہے، یہ بات ہمیں پرزور طریقے سے کہنی چاہیے۔

اردو کے رضاکار اداروں اور دانشوروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اردو آبادی کو یہ یقین دلائیں کہ تعلیم اپنے آپ میں بیش قیمت ہوتی ہے اور اس کی اہمیت کو محض اس کے اقتصادی طور پر سودمند ہونے یا ملازمتوں کے پیمانوں پر نہیں پرکھنا چاہیے۔ ہم کو یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام اپنے خلقیہ کے اعتبار سے ماضی کے نوآبادیاتی تعلیمی نظام کی توسیع ہے اور یہ نظام بنیادی طور پر ادنٰی ملازم اور کلرک پیدا کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اردو معاشرے کو چاہیے کہ وہ خود کو غلامانہ ذہنیت سے آزاد کرے۔ فہم و دانش کے حصول میں مادری زبان کو سب سے بہتر آلے کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہیے۔

سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اردو رہنماؤں کو اپنے احساس کمتری اور اردو کے رسم خط، املا، ان کی مبینہ غیرملکی بنیادوں، یا مفروضہ غیرملکی فوجوں کی چھاؤنیوں میں اس کے ارتقا، جیسی منفی باتوں سے نجات حاصل کرلینی چاہیے۔ ان مفروضوں نے اردو کے شیدائیوں کے ذہنوں کو بھی اتنا ہی زہرآلود اور گمراہ کیا ہے جتنا کہ اردو مخالفوں کے رویوں کو۔ ہمیں اردو کے بارے میں مدافعتی رویہ ترک کرکے افتخار اور تشکر کا رویہ اپنانا چاہیے کہ اردو ہماری زبان ہے۔ ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی اردو پڑھائی جائے وہاں اردو کی درست تاریخ بھی پڑھائی جائے اور اس میں مثبت حقائق سے مدد لی جائے، ان مفروضوں سے نہیں جو انگریزوں اور ہندی قوم پرستوں نے گھڑ لیے ہیں۔

حالانکہ اردو کے رسم خط کے ساتھ بغض و عناد کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ پرانی ہوچکی ہے مگر آج کچھ بااثر حلقوں سے ایسی آوازیں اٹھنے لگی ہیں جو اردو کے ساتھ اپنے تعلق خاطر کا دعویٰ تو کرتی ہیں لیکن اردو رسم خط کو ناگری لپی سے فوری طور پر بدل دینے کی بھی حامی ہیں۔ میں ان کی صرف ایک دلیل دینے پر اکتفا کروں گا: وہ کہتے ہیں کہ آج کے زمانے میں گنتی کے لوگ ہی اردو پڑھتے ہیں اور ناگری رسم خط اختیار کرلینے سے اردو کو بہت ہی کم قیمت پر قارئین کا ایک بڑا حلقہ فراہم ہوجائے گا۔

یہ دلیل ہر اعتبار سے گمراہ کن ہے، لیکن اس کا سب سے اہم نتیجہ تو یہ نکلے گا کہ دیوناگری رسم خط اختیار کرنے سے اردو زبان کی موت یقینی ہوجائے گی کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ اردو رسم خط تاریخی اور تہذیبی طور پر سات سو برس میں ارتقا پذیر ہوا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ عملی طور پر صرف اردو رسم خط ہی اردو کو ہندی سے جدا کرتا ہے اور آئین ہند اس کے رسم خط کے تحفظ کا ضامن ہے۔ دقیق لفظیات کو اگر منہا کردیا جائے تو بول چال کی سطح پر اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں کے بولنے والے باہمی طور پر ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں بلکہ لکھنے کی حد تک بھی یہی بات بہت حد تک درست کہی جاسکتی ہے۔ لہٰذا اگر اردو ناگری لپی کو اختیار کرتی ہے تو یہ فوراً ہی اپنی شناخت کھو بیٹھے گی اور جلد ہی ہندی اسے اپنے اندر جذب کرلے گی۔ اس سے ہندی کو بے شمار فوائد پہنچیں گے: اسے بغیر کسی کوشش کے اردو کا عظیم الشان ادبی اور لسانی سرمایہ حاصل ہوجائے گا۔ اس کے برعکس، اردو اپنے ماضی کا بیشتر سرمایہ کھو بیٹھے گی کیوں کہ اس تمام کلاسیکی سرمائے کو معقول درستی کے ساتھ مناسب وقت کے اندر ناگری میں منقلب کرنا ناممکنات میں ہے۔ اس طرح جلد ہی اس سرمائے تک رسائی ان اردو والوں کے لیے ختم ہوجائے گی جو اردو رسم خط سے واقف نہیں ہیں اور چونکہ ہندی اور اردو زبانیں عملی سطح پر ایک ہی ہیں، اس لیے اردو کو ایک علاحدہ مضمون کے طور پر پڑھنے کی ضرورت کا جواز بھی معدوم ہوجائے گا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہی وقت اردو کے لیے فاتحہ خوانی اور ایصال ثواب کا ہوگا۔

لیکن ٹھہریے، یہاں ہم ایک لمحے کے لیے غور کریں۔ کیا اردو صرف مسلمانوں کا مسئلہ ہے؟ اگر اردو زبان اور اس کا رسم خط قومی منظرنامے سے غائب ہوجاتے ہیں تو کیا ہماری قومی زندگی مزید درماندہ نہ رہ جائے گی؟ اردو زبان اور اردو کی ادبی تہذیب کا زوال برصغیر کے لیے ایک بہت بڑا خسارہ ہوگا اور یہ صرف ادبی یا لسانی زوال تک محدود نہ رہے گا۔ اردو تو ایک تہذیبی ذہنیت ہے، تہذیبوں کے متحد کرنے والی قوت ہے اور ماضی میں کھلنے والا جدید ہندوستان کا سب سے اہم دریچہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی اردو اپنے رسم خط کی وجہ سے باہر کی دنیا سے رابطے کا بھی وسیلہ ہے۔ آخرالذکر کام کو انگریزی زبان بھی ایک خاص حد کے بعد انجام دینے سے قاصر ہے کیوں کہ

انگریزی کی کھڑکیاں وسطی ایشیا اور شرق اوسط کی جانب نہیں کھلتی ہیں۔ انگریزی کی قباحت یہ بھی ہے کہ یہ زبان کچھ دوسرے ایسے کردار ادا کرنے کا آغاز تک بھی نہ کر سکے گی جو اردو کی ادبی تہذیب تاریخی اعتبار سے گذشتہ سات سو برس سے کرتی چلی آرہی ہے۔ اردو ہندوستان کی واحد زبان ہے جس کے ادب کو ہندوستان کے اکثر لسانی طبقوں اور مذہبوں کے لوگوں نے سیکولر اور ثروت مند کیا ہے۔ ہندو، سکھ، نانک پنتھی، عیسائی، جین، بودھ اور پارسی یعنی سبھی کی نمائندگی اردو کی مجلس آفاق میں ہے۔ اردو سے دستبردار ہوجانا تہذیبی خودکشی کے مترادف ہوگا۔

## حواشی:

1. انجمن ترقی اردو ہند کے پلیٹ فارم سے صدر جمہوریہ کو پیش کیا جانے والا یہ محضر آسانی سے دستیاب نہیں۔ اے۔جی۔نورانی نے اپنی حالیہ مرتبہ کتاب The Muslim of India : A Documentary Record (OUP, New Delhi, 2003) میں اس محضر کا مکمل متن اور اردو کے نام پر کی جانے والی سیاست سے متعلق متعدد اہم دستاویزات ص ص 288 تا 345 پر شائع کر دیے ہیں۔ خصوصاً اس محضر سے متعلق ملاحظہ کیجیے ص ص 299 تا 304۔
2. ایضاً۔ ص 305 پر نہرو کے اس عبرت انگیز خط کا مکمل متن موجود ہے۔ پنڈت نہرو سے یہ غلطی بھی ہوگئی کہ انھوں نے محضر کو وزارت تعلیم میں مولانا آزاد کے پاس بھیجا۔ وزارت تعلیم کا کوئی تعلق زبانوں کے آئینی نفاذ سے نہیں۔ ان معاملات کی آئینی ذمے داری وزارت داخلہ کی ہے۔ پنڈت جی کے بھیجے ہوئے کاغذات پر وزارت تعلیم کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی، اور مولانا آزاد کے نام پنڈت نہرو کے محولہ بالا خط نے معاملے پر سرد خانے کی مہر ہی کردی۔ (بعد میں بڑھایا ہوا حاشیہ)۔
3. ابھی 30 اپریل 2005 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو کے جلسے میں ایک معزز رکن نے فرمایا کہ اردو کو روزی روٹی سے جوڑنا بہت ضروری ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ تو انھوں نے کہا کہ ہر ضلع میں ایک اردو کلرک کی اسامی نکلے گی۔ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ (بعد میں بڑھایا ہوا حاشیہ)۔
4. (بعد میں بڑھایا ہوا حاشیہ) میں نے سرسوتی سمان کی تقریر قبولیت میں جناب گجرال سے یہ بات برسر جلسہ کہی تھی۔ میری تقریر اردو اور انگریزی میں کئی جگہ شائع ہوئی ہے۔ میری اصل عبارت اس میں دیکھی جاسکتی ہے۔

**(بشکریہ "شب خون" الہ آباد، اپریل 2006)**

□□□


### مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت

**مصنف: وہاب قیصر**

مولانا ابوالکلام آزاد جدید ہندوستان کے معماروں میں ہیں۔ ان کے سیاسی تدبر، علمی فتوحات اور صحافتی خدمات پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ انھیں سائنس سے بھی بے حد لگاؤ تھا اور انھوں نے آزادی کے بعد بطور وزیر تعلیم ملک کو سائنسی اور ٹیکنالوجیکل ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ اس کتاب میں مولانا آزاد کی سائنسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

**صفحات: 180، قیمت: -/109 روپے**

### تنقید عقل محض

**مصنف: إمانوئل کانٹ، مترجم: ڈاکٹر سید عابد حسین**

یہ جرمن مابعد طبعیاتی فلسفے کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ ہے جو براہ راست جرمن زبان سے کیا گیا ہے۔ فاضل مترجم ڈاکٹر سید عابد حسین نے مصنف کے خیالات کی وضاحت اور زبان کی سلاست کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور منشائے مصنف تک قارئین کی رسائی کو آسان کردیا ہے۔ یہ کتاب 1948 میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کی تھی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر انجمن اور محترمہ صغریٰ مہدی کی اجازت سے کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

**صفحات: 488، قیمت: -/158 روپے**

### اردو میں نظم معریٰ اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

**مصنف: پروفیسر حنیف کیفی**

نظم معریٰ اور آزاد نظم کے موضوع پر یہ کتاب دستاویزی اہمیت کی حامل ہے۔ مصنف نے اپنی شعری روایت کو نظر میں رکھتے ہوئے مغرب میں ان اصناف کے ارتقا کا جائزہ لیا ہے اور مستند نقادوں نے ان کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، ان کے حوالے سے اپنی گفتگو کو وقیع بنایا ہے۔

**صفحات: 608، قیمت: -/182 روپے**

### بھارت 2004

یہ کتاب اردو زبان میں بھارت کے بارے میں معتبر اور مفید معلومات کا خزانہ ہے۔ بھارت کی تمام ریاستوں اور مرکزی علاقوں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی، تجارتی، صنعتی اور لسانی منظرنامے سے مستند واقفیت حاصل کرنے کے لیے آپ کے پاس اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں کے مقابلہ جاتی امتحانات میں حصہ لینے والے طلبہ کے لیے یہ کتاب خصوصی اہمیت اور افادیت کی حامل ہے۔

**صفحات: 949، قیمت: -/250 روپے**

**نوٹ: طلبه اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔**

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

مغنی تبسم

# خطِ نستعلیق

خطاطی کو ایک فنِ لطیف کی حیثیت سے ترقی دینے میں مسلمانوں کا خاص حصہ رہا ہے۔ خالد بن ابوالہیاج نے کوفی خط کو درجۂ کمال پر پہنچایا اور کئی خط ایجاد کیے۔ اس کے بعد کئی ماہرینِ فن پیدا ہوئے اور کئی خطوط ایجاد ہوئے۔ ابنِ مقلہ کے زمانے میں بارہ سے زیادہ رسومِ خط رائج تھے۔ جیسے قلم الجلیل، قلم الدیباج، قلم الزنبور، خطِ مرسع وغیرہ۔

ابنِ مقلہ 31 / مارچ 886 کو بغداد میں پیدا ہوئے۔ مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کی۔ خطِ کوفی کو انھوں نے کمال پر پہنچایا۔ اس کے علاوہ انھوں نے چھ خط ایجاد کیے۔ وہ یہ ہیں: (1) **خطِ ثلث** (2) **خطِ نسخ** (3) **خطِ توقیع** (4) **خطِ رقاع** (5) **خطِ محقق** (6) **خطِ ریحان**۔ ان خطوط کی ایجاد کے بعد بہت سے قدیم خط معدوم ہو گئے۔

934 میں حسن فارسی نے **رقاع** اور **توقیع** کو ملا کر ایک نیا خط **تعلیق** ایجاد کیا۔

ابنِ مقلہ کے ایجاد کردہ چھے خطوط کے بعد خطِ تعلیق کو بھی پایۂ استناد حاصل ہوا۔ جیسا کہ مولانا جامی کہتے ہیں:

کاتباں را ہفت خط باشد بہ طرزِ مختلف
ثلث و ریحان و محقق، نسخ و توقیع و رقاع
بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہلِ عجم
از خطِ توقیع استنباط کروند اختراع

ملا میر علی تبریزی (پیدائش: 1330۔ وفات: 1405) نے **خطِ نسخ** اور **خطِ تعلیق** کو ملا کر ایک نیا خط (نسخ + تعلیق) **نستعلیق** ایجاد کیا۔ اس خط کو میر علی ہروی نے ترقی دی اور میر عماد الحسن قزوینی نے کمال پر پہنچایا۔

نستعلیق کو ''احسن الخطوط'' اور ''عروس الخطوط'' کہا گیا ہے۔ یہ خط خوبصورت اعضائے انسانی کی تمثیل ہے۔ حرف ل میں زلفِ یار کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ اس کی میم کی گھنڈی گویا عقدِ مشکیں ہے۔ حرف صاد میں چشمِ سرگیں کا حسن ہے۔ اس کے آفتابی دائرے حسینوں کے چہرے ہیں، حرف **الف** معشوق کا قامت ہے، حرف میں **س** کے دندانے گوہر دنداں ہیں۔ حرف م کا نزول ساقِ سیمیں کے مانند ہے، **ق** اور **ف** کی گردن حسینوں کی گردن سے مشابہ ہے۔

نستعلیق وہ خط ہے جس نے خطِ تعلیق کو منسوخ کر دیا۔

خطِ نستعلیق کی خوبی اور صفائی کی بنا پر فارسی اور اردو میں بعض محاورے تراشے گئے۔ فارسی میں پُرتکلف گفتگو کرنے کو نستعلیق حرف زدن یا نستعلیق گوئی کہتے ہیں۔ اردو میں شائستہ اور مہذب آدمی کے لیے کہتے ہیں کہ بڑا نستعلیق آدمی ہے۔

خطِ نستعلیق ایک جامع خط ہے۔ تعلیق یا شفیعہ کی طرح اس میں حروف کو ملانے کے لیے غیر ضروری طور پر زائد لکیریں نہیں کھینچی جاتیں۔

موجودہ دور میں دو خطوط نسخ اور نستعلیق ہی زیادہ رائج ہیں۔ خطِ نسخ عربی کے لیے مخصوص ہے۔ کمپیوٹر کتابت سے پہلے اردو ٹائپ میں نسخ استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن اب اردو اور پاکستان کی بعض زبانوں میں خطِ نستعلیق ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

خطِ نستعلیق کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر حرف از روئے قواعد مکمل ہوتا ہے۔ عبارت یا شعر کو مقررہ چوکھٹے میں بٹھانے کے لیے کبھی کشش سے کام لیا جاتا ہے کبھی حرف کے اوپر حرف لکھا جا سکتا ہے۔

نستعلیق میں حروف کو لکھنے کے قاعدے حسب ذیل ہیں:

**(1) الف:**

تین قط کا ہوتا ہے۔ یہ حرف ابتدائی اور آخر میں باریک ہوتا ہے۔ بعض کاپی نویس الف کو پانچ قط میں لکھتے ہیں۔

**(2) ب (پ۔ت۔ٹ۔ث):**

اس کا سر ایک نقطے کا ہوتا ہے۔ آخر کا حصہ سر سے ایک نقطہ نیچے رہتا ہے۔ درمیان میں ڈیڑھ نقطے کا فصل ہوتا ہے۔ خوش نویس اسے گیارہ قط، نو قط، سات قط، پانچ قط یا چار قط سے لکھتے ہیں:

**(3) ج (چ۔ح۔خ):**

اس کا سر نصف ہلال کے مانند ہوتا ہے۔ یہ دو قط کا ہوتا ہے۔ گردن تین قط کی ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ تین قط نیچے اور تین قط اوپر ہوتا ہے۔ قطر تین قط کا ہوتا ہے۔ سر اور گردن میں ایک قط کا فصل ہوتا ہے۔ اس حرف کے دائرے دو طرح کے ہوتے ہیں: بیضوی اور گول۔

**(4) د (ڈ۔ذ):**

ایک نقطہ + ایک ر۔

**(5) ر (ڑ۔ز۔ژ):**

اس کا طول دو قط کا ہوتا ہے۔ سر اور دم نوک دار ہوتی ہے۔

(6) س (ش):

پہلا دندانہ ایک قط یا نصف قط دوسرا دندانہ ڈیڑھ یا ایک قط کا ہوتا ہے۔ دائرہ ن کے قطر کے مانند تین قط اور گردن صراحی دار ہوتی ہے۔

(7) ص (ض):

ایک خم دار خفی خط اوپر کی طرف لے جائیں پھر اس سے تین قط کے قطر کا دائرہ ملا دیں۔ اندرونی حصے میں خربوزے کے بیج کی شکل بنتی ہے۔

(8) ط (ظ):

دو قط کا الف میں ایک سیدھا اور ایک الٹا ''ر'' ملا دیں۔

(9) ع (غ):

سر صاد کی سر کے مانند، دائرہ مثل ج اور زیریں حصہ ب کی طرح ہوتا ہے۔

(10) ف:

ایک نقطے کا سر بنائیں پھر اس میں ب کو ملائیں۔

(11) ق:

ایک نقطے کا سر بنائیں۔ اس سے ایک تین قط کا دائرہ ملائیں۔

(12) ک:

تین قط کا الف لکھیں (قط کی تعداد نو، سات، پانچ یا چار ہو سکتی ہے) اس الف سے ب کو ملائیں۔ الف پر مرکز لگائیں۔

گ:

ک پر ایک اور مرکز لگائیں۔

(13) ل:

ایک الف سے تین قط کا دائرہ ملائیں۔ الٹا لام کے دائرے کے وسط میں ایک نصف نقطہ لگائیں۔ پورا سر ایک نقطے کا ہو۔ اس سے پانچ قط کا الف ملائیں۔

(14) ن:

نصف الف میں تین قط کا دائرہ ملائیں۔ دو قط کا سر + دو قط کی گردن + تین قط کا دامن۔

(15) و:

ایک مدور نقطے سے ر ملا دیں۔

(16) ہ:

ایک نقطہ لگا کر گول کر دیا جاتا ہے۔ دال میں ایک اور چھوٹی معکوس دال۔

(17) دوچشمی ہ (ھ):

دو چشم بادامی آخر میں ر سے ملتی ہوئی ایک لکیر۔ ہ لفظ کی ابتدا میں آئے تو ب کی سی شکل یا کشش بنا کر نیچے لٹکن (ہ) دی جاتی ہے جیسے: ہم۔ اگر لفظ کے درمیان آئے تو کبھی کی شکل بنا کر لٹکن دی جاتی ہے جیسے: کہنا۔

(18) ء:

ہمزا یائے معروف کی گردن کے مطابق ہوتی ہے۔

(19) ی:

یائے معروف کا سر تین نقطوں کا۔ ایک نقطے کی گردن اور ڈھائی یا تین قط کا دائرہ ہوتا ہے۔

(20) ے:

یائے مجہول ایک ر اور ایک ب کے ملنے سے بنتی ہے۔

## مرکبات

دو حروف کو ملانے میں ان اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے۔

(1) کسی لفظ میں دندانے دار اور شوشے دار حروف کو ملانا ہو تو پہلے کو باریک اور دوسرے کو موٹا لکھا جائے جیسے:

ٹکہ - سیر:

(2) دو شوشہ دار حروف کو بلا دندانہ حرف سے ملایا جائے تو پہلا موٹا اور دوسرا مہین ہوگا جیسے:

ذہین - مبین:

(3) ر سے پہلے کوئی حرف آئے تو ر کے لیے دندانہ نہ بنایا جائے بلکہ ماقبل حرف کا سر ذرا اٹھا کر پیوند لگائیں جیسے:

ہنر:

(4) کسی عبارت یا شعر کو مقررہ حدود کے اندر لکھنے کے لیے مد، کشش اور کسی حرف کو دوسرے حرف کے پیٹ میں یا اوپر لکھ دیا جاتا ہے۔

جیسے:

کـــب (کب)۔ نجات (نجات)۔

شــدت (شدت)۔ شــان (شان)۔

مد کو لفظ کے ابتدا یا درمیان میں لانا درست نہیں۔

سبـــتہ اس لفظ کو یوں لکھیں لبـــتہ

کسی لفظ میں ایک سے زیادہ کشش لانا مناسب نہیں۔

اســتغنـــا اس کے متبادل یہ الفاظ ہیں استغنا اور اســـتغنا

س کو کشش دینا احسن ہے۔

کسی لفظ میں کشش اور مد کی گنجائش ہو تو مد کو ترجیح دیں۔

کشش = حـــاســـس ۔ وصـــال :

مد = حساس ۔ وصال :

اساتذہ نے حسن پیدا کرنے کے لیے بڑی نکتہ آفرینیاں کی ہیں۔ اس کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ماہر خطاطوں کی وصلیوں کا بہ غور مطالعہ کیا جائے۔

حکیم اشہر قدیر

# حکیم محمد کبیرالدین اور اردو

اردو کی بقا کے نقطۂ نظر سے بیچلر آف یونانی میڈیسن اینڈ سرجری (بی.یو.ایم.ایس) کا کورس قابلِ توجہ ہے۔ یہ وہ واحد پروفیشنل کورس ہے جس کی ترجمان اردو زبان ہے اس کے علاوہ آج کوئی دیگر پروفیشن ایسا نہیں جس کی ترجمانی یا تعلیم و تدریس اردو کے ذریعے ممکن ہو۔ اس وقت ملک بھر میں بی.یو.ایم.ایس کے تقریباً 34 کالج موجود ہیں جہاں گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن سطح کی معیاری اور اعلا تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے۔ اس کورس میں داخلے کے لیے لازم ہے کہ امیدوار بارھویں جماعت، سائنس کے مضامین (فزکس، کیمسٹری، بایولوجی) سے کم سے کم پچاس فیصدی نمبروں کے ساتھ پاس کرے اور ساتھ ہی ساتھ جماعت ہشتم تک اردو تعلیم کی سند بھی رکھتا ہو۔ علاوہ بریں دینی مدارس سے فارغ عالم فاضل کی سند رکھنے والے طلبہ کے لیے ''پری طب'' (فزکس، کیمسٹری، بایولوجی پر مشتمل ایک سالہ کورس جس میں فاضل کے سند یافتہ کو داخلہ دیا جاتا ہے جس کو پاس کرنے کے بعد وہ بی.یو.ایم.ایس کی تعلیم کے اہل قرار پاتے ہیں) کے ذریعے داخلے کا انتظام ہے۔ چونکہ مدارس کے فارغین کی اردو پر اچھی دسترس ہوتی ہے اس لیے یہ علم طب کے حصول کے لیے اور علم طب ان کے مستقبل کے لیے بہتر ثابت ہوا ہے۔ آج طب یونانی اہل اردو اور اردو کے فروغ میں کلیدی رول ادا کر رہی ہے۔ طبی نصاب کی بیشتر کتابیں اردو میں ہیں۔ طلبہ اپنے نوٹس اردو میں تیار کرتے ہیں۔ طبی درس گاہوں میں جگہ جگہ اردو میں ناموں کی تختیاں نظر آتی ہیں۔ شعبہ جات اور لیباریٹریز کی دیواروں پر آویزاں درسی مواد اردو میں لکھا ہوتا ہے۔ علاج و معالجہ سے متعلق بیشتر امور جیسے نسخہ نویسی اور ہسپتالوں میں مریض کی روداد اور تکالیف اردو میں ہی درج کی جاتی ہیں۔ بازاروں میں دستیاب یونانی ادویہ کے ڈبوں اور پیکنگ پر بھی اردو عبارتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ غرض کہ بی.یو.ایم.ایس کورس کے ذریعے اردو زبان ایک صنعت سے مربوط ہے۔

طب یونانی اور اردو کے درمیان جو تعلق ہے وہ چند اطبائے کرام کی بے لوث فنی اور علمی خدمات کا نتیجہ ہے جنھوں نے طب یونانی کے قدیم سرمائے کو ترجمے کے ذریعے اردو میں منتقل کیا۔ بیسویں صدی سے قبل طب یونانی کی ترجمان عربی اور فارسی زبانیں تھیں۔ لیکن جب ان زبانوں کا حلقۂ اثر تنگ ہوا اور عوامی زبان کا درجہ اردو کو حاصل ہوا تو طبی مفکرین نے دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ اگر طب کا علمی سرمایہ اردو میں منتقل نہ کیا گیا تو اس کا دائرہ جلد ہی بہت محدود ہو جائے گا اور آئندہ نسلیں جو عربی اور فارسی زبانوں سے تقریباً نا آشنا ہوں گی ان تک اس علم کی رسائی ممکن نہ ہوگی۔ یہ گراں قدر خدمات جن اطبا نے انجام دیں ان کی فہرست طویل ہے لیکن انتہائی اہم شخصیات میں حکیم ہادی حسن، حکیم غلام حسنین کنتوری اور حکیم محمد کبیرالدین سرِفہرست ہیں اور ان میں حکیم محمد کبیرالدین کا ایک علاحدہ ہی مقام ہے۔

حکیم محمد کبیرالدین شیخ پورہ، ضلع مونگیر بہار میں 1894 میں پیدا ہوئے اور 9 جنوری 1976 کو بمقام بلی ماران، دہلی میں وفات پائی۔ علامہ نے اپنی 82 سالہ زندگی میں وہ علمی ضیا پاشی کی کہ جس کی چمک صدیوں تک قائم رہے گی۔ آپ ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے لہٰذا علم کی تشنگی آپ کی سرشت میں شامل تھی۔ اس جستجو میں گھر سے باہر قدم نکالا اور اپنے آبائی وطن سے ہجرت کر کے لکھنؤ آگئے اور وہاں کیننگ کالج میں کچھ عرصہ زیرِ تعلیم رہے۔ پھر کانپور تشریف لے گئے اور وہاں حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کے زیرِ عاطفت عربی ادب، معقولات اور منقولات کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے۔ عربی تعلیم سے فراغت کے بعد کانپور سے دہلی آگئے اور 1909 میں مدرسہ طبیہ، گلی قاسم جان، دہلی میں داخلہ لیا اور حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں اور مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے زیرِ تلمذ رہ کر 1911 میں اعلا کامیابی کے ساتھ فن کی تکمیل کی۔ یہی نہیں علم کی تشنگی آپ کو لاہور تک لے گئی اور 1914 میں طبیہ کالج، لاہور سے زبدۃ الحکماء کی سند سے سرفراز ہوکر دہلی واپس آئے۔

اس وقت تک مسیح الملک علامہ کبیرالدین کی علمی صلاحیت سے بخوبی واقف ہو چکے تھے چنانچہ انھوں نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر علم کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنا ہے تو ضروری ہے کہ عربی میں تحریر شدہ طب کی نصابی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔ انھوں نے یہ ذمے داری صدقِ دل سے قبول کی اور قرول باغ دہلی میں دفتر المسیح کے نام سے ایک طبی علمی مرکز قائم کیا۔ علامہ نے ''المسیح'' کے نام سے ایک طبی مجلہ بھی نکالا جو اردو زبان میں طب یونانی کی ترجمانی کا اہم ذریعہ ثابت ہوا۔ علامہ کی علمی خدمات اتنی وسیع ہیں کہ اس ضمن میں متواتر کاوشوں کے باوجود ابھی تک علامہ کی علمی خدمات کا کماحقہٗ جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ علامہ کے طبی تراجم کی فہرست طویل ہے انھوں نے ترجمے کا فریضہ اپنے استاد حکیم اجمل خاں کی منشا کے عین مطابق انجام دیا۔ مسیح الملک کا ترجمے کے بارے میں مطمحِ نظر یہ تھا کہ تمام تالیفات و تراجم میں خواہ وہ طب قدیم سے متعلق ہوں یا جدید سے، متقدمین کا ''طبی شعار'' برقرار

رکھا جائے اور اسلوب بیان ایسا اختیار کیا جائے کہ علوم و معارف میں اسلاف کی مساعی جمیلہ کی قدیم جھلک برابر نظر آتی رہے اور آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کی علمی کاوشوں سے بیگانہ نہ ہونے پائیں۔

چنانچہ علامہ کے طبی تراجم میں یہ تمام شرائط بدرجۂ اتم موجود نظر آتی ہیں۔ بالخصوص عربی زبان سے ماخوذ اصطلاحات کو اردو میں مفہوم کی سالمیت کے ساتھ آپ نے بڑی خوبی سے وضع کیا۔ علامہ کا بطور مترجم بالخصوص طب اور اردو کو مربوط کرنے میں جو اہم کارنامہ ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے طب کی نصابی کتب کو اردو میں منتقل کیا جس کی وجہ سے طب کی تعلیم و تدریس اردو میں ممکن ہوسکی۔ اس ضمن میں علامہ نے لکھا ہے "ہر زمانے کی ایک ضرورت ہوتی ہے اور ہر ضرورت کے ایفا کے لیے ایک موزوں وقت ہوا کرتا ہے۔ 1910 سے قبل جو مہری تعلیم کا زمانہ تھا علوم عربیہ کی کساد بازاری کا احساس ہونے لگا تھا۔ علمِ طب کو عربی زبان میں حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد روز بروز گھٹ رہی تھی۔ ہندستان میں فارسی زبان اس دور میں تقریباً مادری زبان کے برابر سمجھی جاتی تھی اور عربی زبان جاننا تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ضروری شرط متصور ہوتا تھا۔ ماہرین وقت یہ تشخیص کرچکے تھے کہ طب قدیم کو ہندستان میں زندہ رکھنا اور ترقی دینا مقصود ہے تو اس کو اردو میں منتقل کرنا ناگزیر ہے۔"

علامہ نے نہ صرف عربی اور فارسی کتب کے اردو میں تراجم کیے بلکہ اپنے وقت کی بعض "میڈیکل بکس" جو صرف انگریزی زبان میں دستیاب تھیں ان کے بھی اردو تراجم کیے تاکہ طلبہ کو قدیم و جدید طب سے متعلق تمام طبی مواد اردو میں فراہم ہوسکے۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، دکن کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں جب جدید میڈیکل سائنس کی اہم کتابوں کا اردو ترجمہ شروع ہوا تو Grays Anatomy کے اردو ترجمے کے لیے ڈاکٹر اشرف الحق حیدرآبادی کے ساتھ علامہ محمد کبیرالدین کو بھی بطور مترجم شامل کیا گیا تھا۔

علامہ کی ترجمہ کردہ اردو کتب پر ہی بہت حد تک آج کا طبی نصاب مبنی ہے۔ ان کے تراجم کی فہرست درج ذیل ہے۔

1. ترجمہ موجز القانون، 2. ترجمہ شرح اسباب و علامات، 3. ترجمہ کلیات قانون، مع عربی متن (جلد اول)، 4. ترجمہ تعلیمات نفیسی، مع عربی متن، 5. ترجمہ حمیات قانون۔

مندرجہ بالا طبی تراجم کے علاوہ علامہ نے وافر تعداد میں طبی رسائل و جرائد بہ زبان اردو تحریر کیے جن کی تعداد کم و بیش 80 کے قریب ہے۔ ان میں سے جن کتابوں پر آج کا طبی نصاب منحصر ہے اور جن کے ذریعے طب یونانی اور اردو کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ قائم ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

افادۂ کبیر، افادۂ کبیر مجمل، افادۂ کبیر مفصل، کتاب التلخیص، دو جلدیں، کتاب الادویہ تکملہ دو جلدیں، بیاض کبیر حصہ اول، بیاض کبیر تین جلدیں، منافع کبیر، رسالہ نبض، تشریحی تصاویر، تشریح صغیر تین جلدیں، تشریح کبیر دو جلدیں، رسالہ اخلاط، معالجات امراض نسواں، القابلہ، القرابادین، علم الجراحت، امراض صبیان، کتاب العکیس، فرہنگ طبی، لغات کبیر دو جلدیں، تشریحی اصطلاحات، طبی کتابچہ (لغت)، رسالہ اوزان الادویہ۔

اگر آج طب یونانی جیسے پروفیشنل کورس کی تعلیم و تدریس اور ترجمانی اردو زبان کے ذریعے ممکن ہے اور طب کے ذریعے اردو ایک بہترین صنعت اور ذریعۂ معاش سے مربوط ہے تو بلاشبہ اس کا سہرا علامہ محمد کبیرالدین کے سر ہے۔ جنھوں نے بالواسطہ اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی۔ آج ہزاروں اردو جاننے والے طلبہ و طالبات طبی درس گاہوں کا رخ کرتے ہیں اور فن کی تکمیل کے بعد اپنے مستقبل کو روشن بنانے اور اردو کو فروغ دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے وقت کا اہم تقاضہ ہے۔

□□□

7/A, Ghaffar Manzil,
New Delhi-25, Jamia Nagar.

تیز تر اور دور تر (نقل و حمل کی کہانی)

مصنف: میر نجابت علی/ مترجم: مہ جبیں اختر

نقل و حمل انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ پیٹ بھرنے سے لے کر مختلف افراد سے ملنے اور دیگر ضروریات کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا انسان کا شوق بھی ہے اور مجبوری بھی۔ زیر نظر کتاب میں ذرائع نقل و حمل کے مسلسل ارتقائی سفر سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 82، قیمت: 28 روپے

جنگلات کی کاشت

مصنف: ایس. کونداس/ مترجم: مسرت جہاں

جنگل ہمارے لیے اتنے ہی ضروری ہیں جتنی ندیاں، پہاڑ اور دیگر قدرتی اشیا۔ یہ نہ صرف ماحولیاتی توازن برقرار رکھنے میں معاون ہیں بلکہ کئی اہم صنعتوں کا دارومدار بھی ان پر ہوتا ہے۔ اس کتاب میں مختلف جنگلی درختوں اور جنگل سے متعلق مختلف پہلوؤں سے واقف کرایا گیا ہے۔

صفحات: 95، قیمت: 24/- روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

تحریر: جے دیپ مجمدار
ترجمہ: مشرف علی

# اردو کے تئیں بنگالیوں کا بڑھتا رجحان

دو صدیوں کے بعد کلکتہ میں تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج نے اردو ادب کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور آج مغربی بنگال اردو اکادمی یہ خدمات انجام دے رہی ہے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی اس زبان کو مقبول بنانے اور اس کی نشر و اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک مرتبہ پھر اسے مذہبی حدود سے باہر نکالنے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے اور گذشتہ سال سے اکادمی کی کوششوں کے باعث سود مند نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اکادمی اردو کے لیے جو بنیادی اور اڈوانس کورس چلا رہی ہے، اس میں غیر مسلم حضرات بڑی تعداد میں داخلہ لے رہے ہیں۔ وزارت ترقی انسانی وسائل کے ماتحت ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے چلائے جانے والے ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس میں داخلہ لینے والے غیر مسلموں کی تعداد گذشتہ سال 155 تھی اور اس سال اس تعداد سے لگ بھگ دو گنے افراد نے وسط ستمبر سے شروع ہوئے اس کورس میں داخلہ لیا ہے۔ یہ واحد ریاست ہے جہاں غیر مسلموں نے اردو سیکھنے کے لیے اپنی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ مغربی بنگال اس لحاظ سے بھی واحد ریاست ہے جہاں نئے تعلیمی مراکز کا قیام یہاں کے چھوٹے اضلاع اور شہروں میں بھی عمل میں آرہا ہے۔

فورٹ ولیم کالج اس وقت کے گورنر جنرل مارکس ویلزلی نے 1801 میں قائم کیا۔ یہ کالج ایشیا میں اردو کی ترقی اور ترویج و اشاعت کا واحد مرکز تھا۔ برصغیر میں یہ پہلا ادارہ تھا جس میں اردو کا شعبہ موجود تھا۔ پوری دنیا میں اردو کا پہلا چھاپہ خانہ اس کالج میں 1809 میں قائم ہوا۔ اس کالج نے اردو کے دانشوروں کو فارسی اور عربی ادب کا اردو میں ترجمہ کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کی۔ اس کالج سے وابستہ مصنفین کی کتابیں جیسے میر امن کی ''باغ و بہار'' (1802)، شیر علی افسوس کی ''آرائش محفل'' اور ''باغ اردو'' (1805) اور حیدر بخش حیدری کی ''تاریخ نادری'' آج بھی اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کے سکریٹری اخلاق الاسلام کے مطابق غیر مسلموں میں اردو کے تئیں بڑھتی ہوئی دلچسپی کی مختلف وجوہات ہیں۔ اس کی ایک وجہ حالیہ دنوں میں ٹی.وی. پر نشر ہونے والا موسیقی کا پروگرام ہے جس میں لائق اور با صلاحیت نئے چہروں کی تلاش کی جاتی ہے اور جن میں اردو الفاظ اور اصطلاحات کے صحیح تلفظ پر زور دیا جاتا ہے۔ اس بات کا بھی احساس عام ہے کہ اردو ایک زرخیز زبان ہے جس کا حسن شاعری اور نثر دونوں میں جلوہ گر ہے۔ اخلاق الاسلام کے مطابق بنگالیوں میں تہذیبی رجحان دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ مختلف پیشوں سے وابستہ اور مختلف عمر گروپ کے طلبہ کا بھی یہی ماننا ہے۔

سپریا نیوار جو ایک اہم ادارے میں مشیر اعلیٰ ہیں، ان کے مطابق ''اردو ایک خوبصورت زبان ہے۔ مجھے ہمیشہ سے ہی غزل اور شاعری سے لگاؤ رہا ہے۔ میں اردو بولنا جانتا ہوں لیکن لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتا۔ اردو زبان مجھے جس طرح متاثر کرتی ہے اس طرح کوئی دوسری زبان نہیں کرتی۔'' نیوار نے اس سال اردو ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا ہے۔

بھارت بھوشن بسواس کے مطابق بچپن سے ہی غزل سے شغف ہونے کی وجہ سے وہ اردو کی طرف راغب ہوئے۔ ''سبکدوش ہونے کے بعد ہی میرے پاس اتنا وقت تھا کہ میں اس خوبصورت زبان کو سیکھ سکوں۔'' پانچ سال قبل بسواس ایک کمپنی کے سینئر آفیسر کے عہدے سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ گذشتہ سال انھوں نے بنیادی کورس پورا کیا ہے اور اب انھوں نے ایک سالہ اڈوانس کورس میں داخلہ لیا ہے۔

بقول اخلاق الاسلام ''ڈپلوما اور اڈوانس کورس فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت آتے ہیں۔ چونکہ اس میں باقاعدہ کلاسیں نہیں ہوتیں لہٰذا لوگ اپنے خالی اوقات میں اسے سیکھ سکتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ دو کورس جو گذشتہ سال سے شروع کیے گئے ہیں، بہت زیادہ مقبول ہو رہے ہیں۔'' سندیپ رائے چودھری، جورنجل انجینئرنگ کالج، جالندھر سے الیکٹرانکس اور کمیونی کیشن میں گریجویٹ ہیں اور فی الحال بی ایس این ایل میں جونیئر انجینئر کے عہدے پر فائز ہیں، ان کے مطابق فاصلاتی نظام تعلیم کی وجہ سے اس زبان کو سیکھنے میں انھیں آسانی ہوئی ہے۔

اکادمی کو اس سال مختلف اضلاع میں اردو کے سات تعلیمی مراکز کھولنے کی اجازت ملی ہے حالانکہ اکادمی نے قومی اردو کونسل سے 10 مراکز قائم کرنے کی اجازت طلب کی تھی۔ اخلاق صاحب کے مطابق ''آئندہ سال 8 مزید تعلیمی مراکز کھولے جائیں گے۔''

یہ تعلیمی مراکز اسکول، کالج اور مدارس سے وابستہ ہیں جہاں اردو کی تعلیم

باقاعدہ ایک مضمون کی حیثیت سے دی جاتی ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے ڈپلوما اور اڈوانس ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا ہے، ان کے لیے شام میں ہفتے میں تین رابطہ کلاسیں ہوتی ہیں اور اس کے لیے اردو معلم کی تقرری کی جاتی ہے۔ لیکن ان کلاسوں میں حاضری ضروری نہیں ہے۔ طلبہ کو تعلیمی مواد میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر روپ کشن بھٹ (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر) کی کتابیں ہیں، اکادمی کے ذریعے شائع شدہ بنگالی اردو لغت اور سمعی بصری کیسٹ فراہم کیے جاتے ہیں تاکہ انھیں الفاظ کی ادائیگی کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اخلاق الاسلام کے بقول" طلبہ کو ہر تین مہینے پر Response Sheets بھی دی جاتی ہیں۔ طلبہ کو جو گریڈ دیا جاتا ہے وہ قومی اردو کونسل کی جانچ پر مبنی ہوتا ہے۔ طلبہ کے فائدے کے لیے اب اکادمی عملی پروگرام کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔

ایسے افراد جو ڈپلوما کورس مکمل کر چکے ہیں یا جنھوں نے اس کورس میں داخلہ لیا ہے، ان میں ڈاکٹر، انجینئر، گھریلو خواتین، اسکول اور کالج کے معلمین، سرکاری ملازمین، تجارت پیشہ افراد اور صحافی شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر افراد اردو زبان سے اپنی شدید رغبت یا لگاؤ کی وجہ سے اکادمی کا رخ کرتے ہیں۔ حالانکہ ان میں سے چند افراد عملی وجوہات کی بنا پر اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ کلکتہ میں تاریخ کی لیکچرر لینا سرکار کہتی ہیں کہ" اردو سیکھنا میرے لیے پی. ایچ. ڈی. کے کام میں معاون ثابت ہوگا کیونکہ اس سے مجھے اردو میں موجود بیشتر ماخذ کا مطالعہ کرنے اور سمجھنے میں مدد ملے گی۔" Tridip Mustaphi جو ہڈی کے ڈاکٹر ہیں اور ایک ایسی غیر سرکاری تنظیم سے وابستہ ہیں جو مسلم اکثریت والے دیہی علاقوں میں کام کرتی ہے، کہتے ہیں کہ" جن علاقوں میں، میں جاتا ہوں وہاں بیشتر افراد اردو بولنے والے ہیں۔ اگر میں ان کی زبان میں ہی ان سے گفتگو کر سکوں تو اس سے میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ اردو ادب کے مطالعے سے متعلق میری دلچسپی ثانوی ہے۔"

بیشتر افراد بنگال کے چھوٹے شہروں سے ہیں جیسے پرنب آچاریہ جو کہ کلکتہ کے شمال میں سیکڑوں کلومیٹر کی دوری پر واقع شمالی دیناج پور کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ سب رجسٹرار ہیں۔ آچاریہ کہتے ہیں کہ" میں چاہتا ہوں کہ شاعری کو ترنم سے پڑھنے کے قابل ہو سکوں اور میں اردو میں لکھنا بھی چاہتا ہوں۔" آچاریہ نے اس سال ڈپلوما کورس میں داخلہ لیا ہے اور ہفتے میں کم سے کم ایک بار وہ اپنے نزدیک ترین تعلیمی مرکز کے رابطہ کورس میں شامل ہونے کا منصوبہ بنا رہے ہیں جو کہ ان کے شہر سے 95 کلومیٹر دور مالدہ میں ہے۔ یہی حال سوتا مکھوپادھیائے کا ہے جو کلکتہ سے 60 کلومیٹر کی دوری پر واقع چندن ناگور پولی ٹیکنک کالج کے شعبۂ الیکٹرانکس میں لیکچرر ہیں اور وہ ہفتے میں تین بار رابطہ کلاس میں حاضر ہونے کے لیے اس دوری کو طے کرنے کے لیے تیار ہیں۔

لیکن مکھوپادھیائے، آچاریہ اور ان جیسے دیگر افراد کلکتہ کی پرانی روایت کی محض پیروی کر رہے ہیں۔ یہ شہر انیسویں صدی کے آغاز سے لے کر کچھ دہائی قبل تک اردو کا اہم مرکز تھا۔ اردو اسکالر فیاض احمد خاں کے مطابق ''مختلف وجوہات کی بنا پر کلکتہ اردو کے مطالعے، تحقیق اور اس کی ترویج و ترقی کا اہم مرکز رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور ملک کے مختلف حصوں سے بہت سارے دانشوروں نے اس شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ 1911 تک برطانوی ہندوستان کا دارالسلطنت یہیں تھا۔ جب نواب واجد علی شاہ اور ٹیپو سلطان کا خاندان بھی جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے یہاں آبسا تب ان کے دربار کے اردو ادب کے نمائندے بھی ان کے ساتھ یہیں آگئے۔ بنگالی خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو و عیسائی، وہ فنون لطیفہ اور تہذیب کے زبردست دلدادہ ہوتے ہیں اور انھوں نے اس زبان کو سرپرستی عطا کی۔ کلکتہ اردو کے ایک اہم مرکز کے طور پر جانا جاتا تھا اور بہت سارے ممتاز بنگالی ہندو اس زبان کے نامور دانشور تھے۔" بنگلہ زبان کو شاید اس کا خطرہ لاحق نہ ہو کہ وہ دائیں سے بائیں پڑھی جائے لیکن اس زبان کو بولنے والے بلاشبہ اردو سیکھ رہے ہیں۔

(بشکریہ" آؤٹ لک" نئی دہلی، 24 اکتوبر 2005)


**تنقیدی افکار**

**مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی**

شمس الرحمٰن فاروقی کے مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1983 میں چھپا تھا۔ 1986 میں اسے ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ اس میں نظری تنقید، نظریہ نقد اور مشرق و مغرب کی شعریات کے حوالے سے اہم مضامین شامل ہیں۔ تین نئے مضامین کے اضافے کے ساتھ کونسل نے اس اہم کتاب کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔

صفحات: 348، قیمت: -/148 روپے

**عروض، آہنگ اور بیان**

**مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی**

جناب شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے عہد کے معتبر ترین علمائے ادب میں ہیں۔ اس کتاب میں ان کے دس اہم مضامین شامل ہیں جن میں شاعری کے محاسن و معائب کے مروجہ پیمانوں کے جواز اور عدم جواز پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔۔۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر تین نئے مضامین کے اضافوں کے ساتھ قومی اردو کونسل نے اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

صفحات: 340، قیمت: -/144 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی

اظہار اثر

# ہندوستان کی خلائی کامیابیاں

ہندوستان دنیا کا ساتواں بڑا ملک ہے۔ آزادی کے وقت ہندوستان معاشی طور پر بہت مضبوط نہیں تھا مگر ہمارے سائنس داں دنیا کے کسی بھی ملک کے سائنسدانوں سے کم ذہین نہیں تھے۔ انھوں نے 1960 سے ہی خلائی منصوبے بنانے شروع کردیے تھے۔ آخر ہندوستانی حکومت نے خلائی سائنس پر تحقیق کرنے کے لیے 1969 میں ہندوستانی خلائی تحقیق ادارہ (Indian Space Research Organisation) کے نام سے پہلا ادارہ قائم کیا جس کا مختصر نام ''اسرو'' (ISRO) پڑ گیا۔ اس ادارے کا نظم ونسق سنبھالنے کے لیے ''ڈیولپ منٹ آف اسپیس بائی دی گورنمنٹ آف انڈیا'' کے نام سے الگ محکمہ قائم کردیا گیا۔ ''اسرو'' نے وجود میں آتے ہی خلائی سائنس میں اپنی کوششیں تیز کردیں۔ اس نے اپنی ابتدائی کوششوں کے ذریعے ''آریہ بھٹ''، ''بھاسکر''، ''روہنی'' اور ''ایپل'' جیسے مصنوعی سیارے خلا میں بھیجے۔ پھر 1980 کی دہائی میں ''ان سیٹ'' (INSAT) اور آئی آر ایس (I.R.S.) جیسے کامیاب خلائی پروگرام بنائے۔ آج یہ کہا جاسکتا ہے کہ INSAT اور IRS دونوں ''اسرو'' کے اہم ترین کارنامے ہیں۔

شروع میں ''اسرو'' اپنے سیارے کسی دوسرے ملک کے خلائی پلیٹ فارم سے خلا میں بھیجتا تھا لیکن پھر ہندوستانی سائنسدانوں نے خلا میں راکٹ بھیجنے کے لیے اپنے لانچنگ پیڈ بنائے بلکہ اب ہندوستان دوسرے ممالک کے سیاروں کو بھی اپنے لانچنگ اسٹیشنوں سے خلا میں بھیجنے لگا ہے۔

خلائی راکٹ داغنے والے لانچنگ پلیٹ فارم کو لانچنگ وہیکل یا لانچنگ گاڑیاں کہا جاتا ہے۔ ''اسرو'' نے سب سے پہلا لانچنگ پلیٹ فارم اے ایس ایل وی (ASLV) کے نام سے شروع میں بنا لیا تھا۔ اسی پلیٹ فارم سے ہندوستانی خلابازوں نے IRS-P2 نام کا عظیم خلائی جہاز خلا میں بھیجا تھا۔ اس کے بعد 2001 میں ہندوستان اپنا پہلا جیوسنکرونوس (Geosynchronous) خلائی جہاز خلا میں بھیجنے میں کامیاب ہوگیا۔ یعنی یہ سیارہ زمین سے اتنی بلندی پر پہنچا دیا گیا کہ وہ چوبیس گھنٹے مسلسل کرۂ زمین کے شمالی گولے کو الیکٹرانک سگنل بھیج سکتا تھا۔ آج آپ ٹیلی ویژن پر جو تصویریں دیکھتے ہیں یا موبائل فون کے ذریعے دنیا کے ہر حصے میں بات کرسکتے ہیں تو یہ سب کچھ اسی خلائی جہاز کی مدد سے ہوتا ہے۔ زمین سے ٹیلی ویژن، ریڈیو، موبائل فون کی آوازیں اور تصویریں اس خلائی جہاز کو بھیجی جاتی ہیں اور خلائی جہاز میں لگے الیکٹرانک آلات ان برقناطیسی لہروں کو واپس دنیا کے ہر کونے میں بھیج دیتے ہیں اس طرح ہماری آواز فوراً ہی دنیا کے کسی بھی ملک میں موبائل فون پر سنی جاسکتی ہے۔

سائنسداں آسمان اور خلا کے بارے میں صدیوں سے قیاس آرائی اور طرح طرح کے تجربات کرکے خلا کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ سائنسداں یہ بات کافی عرصے سے جانتے تھے کہ خلا میں پہنچ کر کوئی کشش باقی نہیں رہتی اس لیے ہر چیز بے وزن ہوجاتی ہے۔ یعنی خلا میں پہنچنے کے بعد ہر چیز ''انرشیا'' (inertia) کی کیفیت میں پہنچ جاتی ہے۔ انرشیا کا مطلب یہ ہے کہ خلا میں کوئی چیز اگر ایک جگہ رکی ہوئی ہے تو وہ اسی جگہ ٹھہری رہے گی جب تک کوئی قوت اسے کسی طرف دھکیل نہ دے۔ اور کوئی چیز اگر حرکت میں آگئی ہے تو وہ ہمیشہ اسی سمت اور اسی رفتار سے چلتی رہے گی جس رفتار سے اسے کسی قوت نے دھکیلا تھا۔ اس کیفیت میں فرق اس وقت آئے گا جب کوئی دوسری قوت اس کی رفتار اور سمت کو بدل دے۔

انرشیا کے اسی اصول پر آج کل مصنوعی سیارے خلا میں گھوم رہے ہیں۔ ان مصنوعی سیاروں کے زمین کے گرد گھومنے کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمین کی کشش سیارے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن انرشیا اس کو آگے کی طرف دھکیلتا رہتا ہے چنانچہ کوئی بھی مصنوعی سیارہ زمین یا کسی دوسرے سیارے کے گرد گھومنے لگتا ہے۔

یوں تو خلا کو فتح کرنے کے خواب انسان صدیوں سے دیکھتا آرہا ہے لیکن یہ خواب حقیقت میں اس وقت تبدیل ہوا جب 1950 کی دہائی کے آخر میں پہلی بار سوویت یونین نے ایک اسپوتنک یعنی مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا اور وہ قانون فطرت کے مطابق زمین کے چکر لگانے لگا۔ سائنس کے اس کرشمے نے ساری دنیا کو حیران کردیا پھر اس کے کچھ مدت بعد ہی 1961 میں سوویت یونین کے خلائی سائنسدانوں نے ہی گاگارین نام کے پہلے انسان کو مصنوعی سیارے میں بٹھا کر خلا میں بھیج دیا جو زمین کے گولے کے کئی چکر لگا کر بخیریت زمین پر واپس آگیا یعنی وہ پہلا خلائی مسافر تھا جسے روسی زبان میں کوسمونوٹ (cosmonot) کہا جاتا تھا روس کی اس کامیابی سے امریکہ کی بالادستی کو زبردست دھکا لگا اور امریکی حکومت نے ان کامیابیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے خزانے کے منہ کھول دیے اور آخر خلا میں اپنا خلائی جہاز بھیجنے میں کامیاب ہوگئے۔ امریکی خلابازوں کو آسٹرونوٹ (Austronot) کا نام دیا گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد ہی امریکہ اپنے ایک خلاباز کو چاند پر اتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ سوویت سائنسداں تکنیکی طور پر امریکی خلائی سائنسدانوں سے بہت آگے تھے مگر خاطر خواہ مالی وسائل نہ ہونے کی وجہ سے وہ کسی خلاباز کو

چاند پر نہیں اتار سکے جبکہ ان کے بنائے ہوئے مصنوعی سیارے چاند کے گرد چکر کاٹ چکے تھے، چاند پر اتر کر اس کی مٹی کے نمونے لے آئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے مصنوعی سیارے زہرہ اور مریخ تک پہنچ چکے تھے۔

آج ان مصنوعی سیاروں کو خلائی راکٹ یا خلائی جہاز کہا جاتا ہے۔ خلائی سائنس میں سب سے اہم کام کسی انسان کو خلا میں بھیج کر بخیریت زمین پر واپس اتار لینا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تجربات کے دوران روس اور امریکہ دونوں ہی ملک اپنے بہت سے خلابازوں کی زندگیوں سے ہاتھ دھو چکے ہیں جن میں سب سے تازہ حادثہ امریکہ کے کولمبیا خلائی جہاز کا تھا جس میں ہندوستان کی ایک خاتون خلاباز کلپنا چاولا بھی ہلاک ہوگئی تھیں۔ ساری دنیا میں اب تک تین ملک اس قابل تھے کہ وہ اپنے خلابازوں کو خلا میں بھیج سکیں لیکن اس سال چین کے خلائی سائنسدانوں نے بھی اپنے ایک خلاباز کو خلا میں بھیج کر اس فہرست میں اپنا نام درج کرالیا ہے۔ چین کے اس خلائی جہاز کا نام ''شین زہو''(Shenzhou) ہے جس کا مطلب ہوتا ہے ''قدرت کا جہاز'' اور چینی سائنسداں اپنے خلابازوں کو تائکوناٹ(Taikonaut) کہتے ہیں۔

ہندوستانی سائنسداں اپنی کوششوں میں مصروف ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ہندوستان بھی خلا میں اپنے خلاباز بھیجنے کے قابل ہوجائے گا۔ اس سلسلے میں ہندوستان کا پہلا قدم یہ ہے کہ وہ اپنا پہلا خلائی جہاز چاند تک بھیجے گا جس کا نام ''چندریان'' رکھا گیا ہے۔ خلائی سائنسداں دن رات اس پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں اور قوی امید ہے کہ ''چندریان'' اگلے دو سال تک اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہوجائے گا۔ تمام ترقی یافتہ ملکوں نے پہلے اپنے خلائی جہاز چاند کے گرد چکر لگانے کے لیے ہی بھیجے تھے۔ ان مصنوعی سیاروں کے ذریعے ہی وہ چاند کی دوسری سمت والا حصہ دیکھنے کے قابل ہوئے۔ یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ چاند زمین کے گرد اس طرح گھومتا ہے کہ ہمیشہ اس کا ایک ہی حصہ زمین کے سامنے رہتا ہے اس لیے ہم چاند کے دوسری طرف والا حصہ نہیں دیکھ سکتے۔ امید ہے کہ ''چندریان'' کے ذریعے چاند کی دوسری جانب کی تصویریں لی جاسکیں گی۔ چاند کے قریب پہنچ کر وہ کس کس طرح کے تجربات کرے گا اس کا فیصلہ چندریان بنانے والے سائنسداں کریں گے۔ مختصر یہ ہے کہ اب ہندوستان دنیا کے ان ملکوں کی فہرست میں آگیا ہے جو کسی کی مدد کے بغیر خود اپنے خلائی جہاز دور دراز کے سیاروں تک بھیج سکتے ہیں۔

Y-5, New Ranjit Nagar, New Delhi-110008


آندھی (منظرنامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظرنامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جاسکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کرلے۔ فلم ''آندھی'' کا یہ منظرنامہ کملیشور کے ناول ''کالی آندھی'' پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ مجموعی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

انتخابِ کلامِ حسرت

مرتب: فضل امام

بیسویں صدی میں اردو غزل کے احیا میں جن شعرا نے اہم کردار ادا کیا ان میں سید فضل الحسن حسرت موہانی کو امام المتغزلین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں حسرت کے غزلیہ کلام کا ایک جامع انتخاب پیش کیا گیا ہے اور شروع میں ان کے شاعرانہ امتیازات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 91، قیمت: -/9 روپے

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہدِ مرزا میر تک)

مصنف: محمد یعقوب عامر

ادبی معرکوں کا ذکر دنیا کی اکثر زبانوں میں ملتا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ یہ معرکے جہاں جذبۂ مسابقت کو مہمیز کرتے تھے وہیں ان کے نتیجے میں ایک خاص قسم کا ادب وجود میں آیا جو مصنف کی شخصیت کو بے نقاب کرتا ہے اور جس کا تجزیہ اس کی زندگی اور اس کے کردار کے بہت سے نامعلوم گوشوں کو سامنے لاتا ہے جس سے فنکار کے فن کی بہت سی گرہیں کھلتی ہیں۔ محمد یعقوب عامر نے اس کتاب میں ابتدا سے عہد مرزا میر تک کے ان ادبی معرکوں کا احاطہ کیا ہے جو اردو کی ادبی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

صفحات: 251، قیمت: -/22 روپے

گرزی کہانی

راجا کمی (ایک جاتک کہانی)، لالو بندر بھلو مگرمچھ (پنچ تنتر کہانی)، رنگیلا گیدڑ (پنچ تنتر کہانی)، بے سُرا ڈھوڈو (پنچ تنتر کہانی)

ان دلچسپ اور سبق آموز قدیم کہانیوں کو عہد حاضر کے مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر گلزار نے ان کتابوں میں ایک نئے انداز سے ہندوستان کی موجودہ بول چال کی زبان میں دہرایا ہے جس میں اردو، ہندی اور انگریزی الفاظ آپس میں گھل مل گئے ہیں۔ یہ کتابیں بطور خاص اردو کونسل کے یک سالہ ''ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج'' کے لیے مفید ثابت ہورہی ہیں۔ کتابوں کے ساتھ ان کے کیسٹ بھی تیار کیے گئے ہیں تاکہ الفاظ کا رائج تلفظ بھی ذہن نشین کرایا جاسکے۔

قیمت: (پورا سیٹ مع کیسٹ) -/280 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

بھرت جھن جھن والا

# زراعت کا مستقبل

حکومت زراعت میں بڑی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہے تاکہ اعلیٰ معیار کی زرعی مصنوعات کی برآمدات میں اضافہ ہو۔ ساتھ ساتھ عالمی تنظیم تجارت (wto) کے دباؤ میں سرکار زرعی پیداواروں کی درآمدات کو کھولنا چاہتی ہے تاکہ ہمارے صارفین کو سستا مال مل سکے۔ اس پالیسی کے برعکس بائیں بازو کی جماعتوں کا کہنا ہے کہ بڑی کمپنیوں کے ذریعے زرعی پیداواروں سے برآمدات میں اضافہ ہو تو بھی ملک کے بیشتر کسانوں کو فائدہ نہیں ہوگا۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ امیر ممالک کے ذریعے دی جا رہی رعایت (سبسڈی) میں تخفیف پہلے کی جانی چاہیے، غریب ممالک کے بازار کو درآمدات کے لیے بعد میں کھولنا چاہیے۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کے مطابق امیر ممالک سے تعاون کرنے کی بجائے ہندوستان کو دوسرے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ مل کر امیر ممالک کا سامنا کرنا چاہیے۔

بائیں بازو کی جماعتوں کے ذریعے اٹھائے گئے دونوں نکات درست ہیں۔ بڑی کمپنیوں کے ذریعے زرعی پیداوار سے ملک کے 60 کروڑ دیہی عوام کو فائدہ نہیں ہوگا۔ امیر ملک اس وقت بڑے پیمانے پر اپنی زرعی مصنوعات پر رعایت دے رہے ہیں۔ اگر ان کی زرعی پیداواروں کی درآمدات کو کھول دیا گیا تو سبسڈی کے ذریعے وہ ہمارے بازار میں داخل ہو کر ہمارے کسانوں کو فوراً برباد کر دیں گے۔ بعد میں ان کے ذریعے سبسڈی میں کمی کرنے کا خاص فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ ہمارا زرعی نظام ٹوٹ چکا ہوگا۔ سرکار کو بائیں بازو کی پارٹیوں کے ذریعے اٹھائے گئے اعتراضات پر مثبت طرز فکر اپنانا چاہیے۔

لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ عالمی تنظیم تجارت بننے سے پہلے بھی ہندوستانی زراعت کی حالت بگڑ رہی تھی۔ ماضی میں بڑی کمپنیوں کو زرعی پیداوار کی چھوٹ نہیں تھی اور امیر ممالک کی زرعی پیداواروں کو درآمد کرنے کی چھوٹ بھی نہیں تھی۔ پھر بھی ہندوستانی زراعت کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ 1951 میں ہندوستان کی آمدنی میں زراعت کا حصہ 60 فیصد تھا جو کہ 2000 میں گھٹ کر 27 فیصد رہ گیا تھا۔ 1951 میں 72 فیصد عوام دیہی علاقوں میں رہتے تھے۔ جو 2000 میں 55 فیصد رہ گئے تھے۔ یعنی کھیتی میں گراوٹ کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ یہ درست ہے کہ بڑی کمپنیوں کو زرعی شعبے میں داخلہ دینے اور درآمدات کو کھولنے سے اس گراوٹ میں تیزی آسکتی ہے۔ لیکن اس پالیسی کے بغیر بھی گراوٹ جاری رہے گی۔ بائیں بازو کی پارٹیوں کے ذریعے سجھائی گئی پالیسیوں سے تیز گراوٹ کی بجائے دھیمی رفتار سے گراوٹ ہوگی۔ یہ مسئلے کا بنیادی حل نہیں ہے۔ ہمیں ایسی حکمت عملی تیار کرنی ہوگی کہ ملک کی اکثریت کی زندگی میں گراوٹ کی بجائے ترقی کا دور شروع ہو جائے۔ لہٰذا ہمیں زراعت میں گراوٹ کے بنیادی سبب کو سمجھنا ہوگا۔ بیماری کی تشخیص کے بعد ہی صحیح نسخہ لکھا جا سکتا ہے۔ زراعت کا بنیادی مسئلہ مال کے گرتے دام ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ 80 کی دہائی میں گیہوں کی قیمت تقریباً 5 روپئے کلو تھی جو آج 10 روپئے کلو ہے۔ گیہوں کی قیمت میں صرف دوگنا اضافہ ہوا ہے جب کہ ماروتی کار کی قیمت چار گنا بڑھی ہے۔ کار کے مقابلے میں گیہوں سستا ہو گیا ہے۔ عالمی آبادی میں اضافہ کم ہونے سے زرعی پیداواروں کی کھپت مستحکم ہے جبکہ پیداوار بڑھتی جا رہی ہے۔ عالمی بینک کے ذریعے شائع ''گلوبل اکنامک پروسپکٹس رپورٹ'' کے مطابق کافی کی موجودہ قیمت 1960 کی قیمت سے ایک تہائی رہ گئی ہے۔ برازیل اور ویتنام نے کافی کی پیداوار بڑے پیمانے پر شروع کر دی ہے جس سے مال کی سپلائی میں اضافہ ہوا ہے لیکن مانگ مستحکم ہے اور کافی کی کھپت 4.5 کلو فی آدمی سالانہ پر قائم ہے۔ محدود مانگ کے سامنے پیداوار میں اضافے سے قیمتوں میں گراوٹ آ رہی ہے۔ اسی طرح چائے، چینی و ربڑ کی قیمتیں بھی گرتی جا رہی ہیں۔ قابل توجہ ہے کہ یہ گراوٹ ڈبلیو ٹی او کے وجود میں آنے کے پہلے سے ہو رہی ہے۔ لہٰذا اگر ڈبلوٹی او کے دباؤ کو برداشت کر کے ہم زرعی پیداواروں کے درآمدات نہیں کھولتے ہیں تو بھی مسئلہ برقرار رہے گا۔ جب عالمی بازار میں کافی، چینی، چائے اور ربڑ کی قیمتیں گر رہی ہیں تو ہمارے کسان کے ذریعے پیدا کیے گئے مال کو کہاں بیچا جائے گا؟

ایک امکان یہ ہے کہ زرعی پیداوار کرنے والوں کے فیڈریشن بنائے جائیں۔ مثلاً دنیا میں کافی کی پیداوار بنیادی طور پر برازیل، ہندوستان اور ویتنام میں ہوتی ہے۔ یہ تین ممالک اگر متحد ہو جائیں تو عالمی بازار میں کافی کی قیمت بڑھا سکتے ہیں۔ اسی طرح ہندوستان اور سری لنکا مل کر چائے کی، ہندوستان اور بنگلہ دیش جوٹ کی، ہندوستان اور ملیشیا ربڑ کی قیمتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک کی تنظیم ''اوپیک'' نے تیل کی قیمتوں میں اسی طرح اضافہ کیا تھا۔ حکومت کو اس سمت میں کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن یہاں بھی منافع کی حد ہے۔ تیل کی پیداوار کو قدرت نے محدود کر دیا ہے۔ درحقیقت انسان تیل بناتا نہیں ہے۔ وہ قدرت کے ذریعے فراہم

کردہ تیل کو محض برآمد کرتا ہے۔ تیل کو ہر جگہ نہیں نکالا جاسکتا ہے لیکن کافی، چینی، چائے اور ربڑ کی پیداوار کئی مقامات پر ہوسکتی ہے۔ ہندوستان، برازیل اور ویتنام میں کافی کی پیداوار کے لیے آب و ہوا سازگار ہونے سے پیداوار میں لاگت کم آتی ہے۔ اگر ان ممالک نے کارٹیل بنا کر کافی کی قیمت میں اضافہ کردیا تو کافی کی قیمت بڑھے گی اور اس کی پیداوار دوسرے ممالک میں بھی فائدہ مند ہوجائے گی۔ لہٰذا کارٹیل بنا کر کیا گیا اضافہ زیادہ نہیں ہوسکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ عالمی آبادی میں اضافہ کم ہونے کے سبب پیداواروں کی کھپت نہیں بڑھ رہی ہے اس لیے زرعی مصنوعات کی قیمتیں گر رہی ہیں اور کھیتی خسارے کا سودا رہ گئی ہے۔ زراعت کا مستقبل تاریک ہے۔ ہمیں ایسے مال کی تلاش کرنی چاہیے جس کی کھپت میں ٹھہراؤ نہ آئے۔ ایسا شعبہ خدمات کا ہے۔ تعلیم، اطلاعات اور تفریح کی کھپت کی کوئی حد نہیں ہے، انسان اپنی زندگی میں بہت سی کتابیں پڑھ سکتا ہے، فلم دیکھ سکتا ہے، گانے سن سکتا ہے، نئے فیشن کے کپڑے پہن سکتا ہے۔ ان خدمات کی کھپت میں بہت اضافے کا امکان ہے۔ ان خدمات کی پیداوار کی حد بھی نہیں ہے۔ کافی کی پیداوار وہیں ہوسکتی ہے جہاں موسم گرم اور نم ہو۔ کشمیر اور پنجاب میں کافی پیدا نہیں ہوسکتی، لیکن موسیقی ہر جگہ پیدا ہوسکتی ہے۔

بائیں بازو کی پارٹیوں کو کھیتی کے معاملے میں ضرور دباؤ بنانا چاہیے جیسا کہ وہ کررہی ہیں لیکن اس حکمت عملی سے قیمتوں میں ہورہی گراوٹ سے وقتی طور پر راحت مل سکتی ہے۔ اس سے بالآخر کسان کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کھیتی کے تاریک مستقبل کی بات کو قبول کرتے ہوئے بائیں بازو کی جماعتوں کو خدمات کے شعبے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

امیر ممالک کو معلوم ہے کہ ان کے ذریعے زراعت پر سبسڈی ہٹانے سے بالآخر انھیں ہی فائدہ ہوگا۔ ان کی حکومتوں کا مالی خسارہ کم ہوگا۔ ساتھ ساتھ انھیں سستا مال بھی ملے گا۔ اس لیے بائیں بازو کی جماعتوں کو زراعت کو اصل مدعا نہ بنا کر خدمات کے شعبے کو اصل مدعا بنانا چاہیے۔ ہمیں مطالبہ کرنا چاہیے کہ ہمارے وکلا، اساتذہ اور موسیقاروں کو امیر ممالک میں آمد و رفت کی چھوٹ ملے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے دیہی عوام کو خدمات کے شعبے میں منتقل کرنے کی حکمت عملی وضع کرنی چاہیے۔

732, Modem Society, Sector 15, Rohini,
Post Box 10754, Delhi-110085

□□□

**ہری بھری دنیا کے لیے**

**مصنف: ایرا سکینہ/مترجم: طلعت گل**

ایک دلچسپ سائنس فکشن جس میں دوسری دنیا کی مخلوقات کے ساتھ مل کر ہماری دنیا کے بچے ایک مہم پر روانہ ہوتے ہیں اور اس میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

صفحات: 118، قیمت: -/28 روپئے

**شہر میں ایک جنگل**

**مصنف: کمارن ست سیلوم/مترجم: عباس آصف**

چینئی (مدراس) غالباً دنیا کا واحد شہر ہے جس کی حدود کے اندر حقیقی معنوں میں جنگل کا وجود ملتا ہے۔ اس کتاب میں آئی آئی ٹی چینئی کے جنگل میں مصنف اور اس کے دوستوں نے جو تجربے کیے انھیں افسانوی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب سے جنگل کے چرند پرند اور دیگر حشرات الارض کے ساتھ ساتھ مختلف قدرتی اشیا سے متعلق بھی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

صفحات: 75، قیمت: -/19 روپئے

**کسوما**

**مصنف: معصوم جمکسف/مترجم: اقبال مہدی**

سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ہماری دنیا کو نت نئی تبدیلیوں سے ہمکنار کررہی ہے۔ بیل گاڑی سے ترقی کرکے آج انسان مریخ پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ اس کتاب میں ان ترقیات کے پیش نظر اب سے ایک ہزار سال بعد کی دنیا کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

صفحات: 102، قیمت: -/23 روپئے

**مکمل موصلیت**

**مصنف: دلیپ ایم سالوی/مترجم: گوہر رضا**

مکمل موصلیت (سپر کنڈکٹیوٹی) دور جدید کی ایک اہم ایجاد ہے جس سے برقی توانائی کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ اس کتاب میں مکمل موصلیت سے متعلق تمام تفصیلات پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ایجاد کی کہانی بھی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 24، قیمت: 10 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شہیر عباسی

# ٹیپو سلطان کی شکست

اٹھارھویں صدی کے دوسرے نصف کے ہندوستان میں رونما ہونے والے واقعات کسی دوسری جگہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان تعلقات سے اتنے لاینحل طور پر وابستہ تھے کہ انھیں الگ سے بیان کرنا مناسب نہیں ہوگا۔

دراصل پیرس کے معاہدے (1763) نے برطانیہ اور فرانس کو، نظام حیدرآباد صلابت جنگ کو دکن کے صوبے دار، اور محمد علی کو کرناٹک کے نواب کی حیثیت سے تسلیم کرنے پر پابند کردیا تھا۔ اس طرح دیکھا جاسکتا ہے کہ دونوں یورپی طاقتوں نے اپنے آپ کو سرکاری تقرریاں کرنے اور مغل سلطنت کے علاقوں میں انتظامی امور کا فیصلہ کرنے کے حق سے دستبردار کرلیا تھا۔ یہ کسی قدر 1761 میں پانی پت میں مراٹھوں کی شکست کی وجہ سے تھا، ایک ایسی شکست جس نے ملک کو بہاؤ کی حالت میں لاکھڑا کیا تھا۔ متعدد نئی ریاستیں وجود میں آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے پاس قدرتی سرحدیں تھیں اور رہر حکمراں اپنے ہمسایوں کے مصارف سے آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ راجپوت ریاستیں مراٹھا اقتدار کو دوبارا قائم کرنے کی کوشش کررہی تھیں اور ایسے حکمراں جیسے کہ شمال میں اودھ اور جنوب میں کرناٹک اور حیدرآباد کسی بھی معاہدے کے خیرمقدم کے لیے تیار تھے جو انھیں فوری خطرات سے کچھ راحت دلانے میں معاون ہوسکیں۔ اس میں کچھ تعجب کی بات نہیں کہ کرناٹک اور اودھ کے حکمرانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سائے میں پناہ حاصل کی۔

حیدر علی جو ناخواندہ اور غیر تعلیم یافتہ اور ایک پنجابی فقیر کا بیٹا تھا، وہ جنگ وجدل اور انتظامیہ دونوں میں عظیم صلاحیتوں والا ایک مہم جو تھا۔ وہ میسور کے راجا کی ملازمت میں ایک دیوان کی حیثیت سے داخل ہوا اور 1769 میں اقتدار پر قابض ہوگیا۔ حیدر علی نہایت زیرک، زود فہم اور مضبوط قوت ارادی کا مالک تھا۔ کرناٹک کے نواب، محمد علی کی فرمانروائی میں، جو کہ انگریزوں کے زیر حمایت تھی، طوائف الملوکی قائم تھی۔ وہ ہر چیز کے لیے برطانوی فوجی مدد کا محتاج تھا۔ اس کا بھائی، جو تخت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، بظاہر مکہ کی زیارت کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے ایک غیر معمولی چکردار راستہ اختیار کیا جس کے ذریعے وہ اپنے ہمسایہ، میسور کے حیدر علی کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے زیارت کا اپنا ارادہ ترک کردیا اور میسور کے حکمراں سے ایک صلاح کار کی حیثیت سے وابستہ ہوگیا۔ حیدر علی، جو محمد علی کا زیادہ احترام نہیں کرتا تھا، اپنی لالچی نگاہیں کرناٹک کے علاقوں پر جمائے ہوئے تھا۔ محمد علی بھی انگریزوں کی مدد سے اپنے ہمسایوں کے اقتدار پر تسلط جمانے کی آس لگائے ہوئے تھا۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ کون کس سے لڑ رہا ہے۔ حالات بہت نازک تھے۔

فرانسیسیوں نے بھی اپنا دعویٰ جتایا اور مقامی حکمرانوں کے ساتھ مل گئے، خاص طور سے اس وقت جب موخرالذکر انگریزوں سے مایوس ہوگئے تھے۔ فرانسیسی کسی طرح ہر اہم مرحلے پر موجود رہتے تھے۔ انھوں نے ہندوستانی درباروں میں دوبارا بالادستی حاصل کرنے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ اپنے وقت کے تمام سلاطین میں سے صرف حیدر علی ہی یہ جانتا تھا کہ جس طاقت کو برصغیر سے نکال باہر کرنے کی ضرورت ہے وہ انگریز ہے۔ اس طرح اس نے انھیں علاحدہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری جانب انگریزوں نے بھی اسے علاحدہ کرنے کی کوشش کی۔ حیدر علی، مراٹھا، نظام اور انگریز، ان چاروں کے درمیان کئی جوابی معاہدے ہوئے، جس کے درمیان میں بعض فرانسیسی گروہ کے لوگ بھی شامل تھے۔ چونکہ انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن حیدر علی تھا، لہٰذا وہ نظام کے ساتھ معاہدے میں شامل ہوگئے، اور حیدر علی کے خلاف ایک مشترکہ محاذ بنایا۔ تیسری پارٹی، یعنی مراٹھوں نے میسور پر حملہ کیا۔ حیدر علی نے کسی طرح انھیں خرید لیا۔ نظام نے انگریزوں کی مدد سے میسور پر دھاوا بولا۔ لیکن حیدر علی نے نظام کو پیچھے دھکیل دیا۔

ایک موقعے پر انگریز حیدر علی کی مدد کرنے کے لیے تیار ہوگئے تھے اگر اس پر کسی دوسرے کے ذریعے حملہ ہوتا ہے۔ لیکن جب مراٹھوں نے حیدر علی پر حملہ کیا تو انگریزوں نے اسے مایوس کیا۔ حیدر علی اس بات سے مشتعل ہوگیا۔ تو جس وقت انگریزوں نے ایک فرانسیسی آبادی، ماہے پر قبضہ کیا جو کہ حیدر علی کی فرمانروائی میں آتا تھا، تو مؤخرالذکر نے نظام اور مراٹھوں کے ساتھ مل کر ایک معاہدہ قائم کیا اور اسی ہزار آدمیوں اور سو

"Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

بندوقوں کے ساتھ کرناٹک کے میدانوں کی طرف کوچ کیا، بالکل کسی برفانی تودے کی طرح جو تباہی و بربادی کو اپنے ساتھ لے کر چلتا ہے۔

حیدرعلی نے انگریزوں کو شکست دی اور آرکاٹ پر قبضہ کرلیا، جہاں کے لوگ نواب کی بے رحمیوں سے تنگ آچکے تھے اور انھوں نے حیدرعلی کا خیرمقدم کیا۔ عظیم سپہ سالار، حیدرعلی نے مغربی خطوں کے کھلے میدانوں میں انگریزوں سے لڑائی کرنے سے انکار کردیا۔ اس نے ایک انگریز سپہ سالار کے خط کے جواب میں لکھا تھا:

''وقت آنے پر تم لڑائی کے طریقۂ کار کو سمجھ جاؤ گے۔ کیا میں اپنے سوار دستوں کو، جس کا ہر گھوڑا ہزار روپے کی قیمت رکھتا ہے، تمھارے توپ کے گولے کے مقابلے میں خطرے میں ڈالوں گا جس کی قیمت صرف دو پیسے ہے؟ نہیں، میں تمھاری فوجوں کو اس وقت تک دوڑاؤں گا جب تک کہ ان کے پاؤں پھول کر ان کے جسموں کے برابر نہ ہو جائیں۔ تمھیں گھاس کی ایک پتی بھی نہیں ملے گی، اور نہ ہی پانی کی ایک بوند۔ جب بھی تمھارے نقارے بجیں گے مجھے ان کی آواز سنائی دے گی، لیکن تم نہیں جان سکو گے کہ میں کہاں ہوں۔ مہینے میں ایک بار، میں تمھاری فوج سے لڑائی کروں گا۔ لیکن اس کا سارا انحصار میری مرضی پر ہوگا، اور اس میں تمھارے انتخاب کو کوئی دخل نہیں ہوگا۔''

انگریز اتنی مشکل صورت حال میں پھنس گئے تھے کہ وارن ہیسٹنگس نے نہایت وحشتناک صورت حال میں ہالینڈ سے مدد کی درخواست کی اور انھیں جاگیریں پیش کیں۔ لیکن برطانیہ اور ہالینڈ کی جنگ نے اس قسم کے معاہدے یکسر خارج کردیے تھے۔

سر الفریڈ لائل کے مطابق، ہندوستان میں انگریزوں کی قسمت بہت ادنیٰ سطح تک پہنچ گئی تھی۔ اس وقت ہیسٹنگس نے بنگال سے سر آئر کوٹ کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج روانہ کی، جس نے نظام اور مراٹھوں کو حیدرعلی سے علیحدہ کردیا۔ اس وقت کئی لڑائیاں ہوئیں۔ جبکہ تقدیریں بدل رہی تھیں۔

انگریزوں نے حیدرعلی کی فوجوں کو شکست دی۔ اس وقت فرانسیسی جنرل بسی کی ماتحتی میں تین ہزار کی ایک فوج کے ساتھ واپس آئے۔ ڈی سفرن کی رہنمائی میں ایک بحری فوج نے مستقل برطانوی جہازی بیڑوں کا تعاقب کیا۔ لاتعداد اور غیر فیصلہ کن لڑائیاں ہوئیں۔

7 دسمبر 1782 کو کینسر کی وجہ سے حیدرعلی کی موت واقع ہوگئی۔ اس سے اگلے سال برطانیہ اور فرانس کے درمیان امن رہا۔ فرانسیسیوں نے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ حیدرعلی کے بیٹے، ٹیپو سلطان نے اپنی فوجوں کو دوبارا منظم کرنے کے مقصد سے منگلور کے معاہدے کے ذریعے عارضی طور پر صلح کرلی۔

انگریزوں اور میسور کے درمیان تیسری لڑائی نئے گورنر، جنرل کارنوالس نے شروع کی جو 1786 میں ہندوستان آیا تھا۔ اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور ایسا غیر مہذب طریقہ اختیار کیا جو نہ صرف عقیدے کے لحاظ سے قابل اعتراض تھا بلکہ ٹیپو سلطان کے لیے نہایت توہین آمیز تھا۔ مئی 1790 میں انگریزوں اور ٹیپو سلطان کی فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ اگلے مہینے کارن والس نے نظام اور مراٹھوں کے ساتھ معاہدے کیے اور انھیں پابند کیا کہ وہ میسور پر ایک متحد حملے میں اس کی مدد کریں۔ انگریزوں کی رہنمائی میں متحدہ افواج نے ایک طویل جنگ لڑی اور سرنگا پٹنم کا محاصرہ کرلیا۔ انھوں نے من مانے طریقے سے ٹیپو پر صلح کی شرائط مسلط کردیں اور اسے مجبور کیا کہ وہ ہرجانے کے طور پر ان علاقوں کے حق سے دستبردار ہوجائے جنھیں اس کے باپ نے اپنے ہمسایوں سے فتح کیا تھا۔ نیز یہ کہ وہ اپنے دو بیٹوں کو ضمانت کے طور پر انگریزوں کے حوالے کرے کہ وہ معاہدے کی شرائط کا پابند رہے گا۔ یہ 1792 کا واقعہ ہے۔ ٹیپو کے لیے یہ صورت حال بے حد نازک تھی۔ اس نے تقریباً اپنی نصف ریاست کے عوض میں امن معاہدہ کیا تھا اور اسے توقع تھی کہ ازسرنو اپنی طاقتوں کو بروئے کار لانے میں اس کے لیے مددگار ہوگا۔ اسے ابھی بھی یہ امید تھی کہ وہ پہلے نظام کو اکھاڑ پھینکے گا، پھر مراٹھوں کو، اور پھر آخر میں انگریزوں کو جن سے وہ بے حد نفرت کرتا تھا۔

انگریزوں کے خلاف ایک متحد محاذ قائم کرنے کے لیے ٹیپو نے عرب، افغانستان اور ترکی کو اپنے سفارت کار بھیجے۔ اس نے فرانس کو بھی ایک درخواست بھیجی جو اس وقت انقلاب کے دور سے گزر رہا تھا۔ جزیرۂ فرانس کے گورنر نے فرانس کے دوست ٹیپو کو رضاکارانہ مدد کے لیے اپیل کی۔

واقعات نے ایک فیصلہ کن رخ اختیار کیا۔ 1793 میں برطانیہ اور انقلابی فرانس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ اب ہندوستان کے معاملات میں انگریزوں کے خلاف فرانس کی مداخلت بڑی حد تک ممکن ہوگئی تھی۔ ٹیپو نے دراصل اس برطانیہ۔ فرانس اختلافات کو اپنے لیے خوش آئند سمجھا اور 1792 میں انگریزوں کے ہاتھوں اپنی شکست کا بدلہ لینے کا ایک موقع تصور کیا۔ اس نے فرانس سے دوستی کرلی۔ خود اپنے ہاتھوں سے اس نے سرنگا پٹنم میں آزادی کا بیج بویا اور فرانسیسی جھنڈا لہرایا۔ نیز اس نے اپنی دارالحکومت کے درجنوں فرانسیسیوں کو ایک جیکبن کلب قائم کرنے میں مدد کی جس کا وہ خود بھی ممبر تھا۔

1793 میں جہاں ایک طرف برطانیہ یوروپی طاقتوں کے ایک متحدہ محاذ کے ساتھ لڑ رہا تھا، وہیں پر فرانس یک وتنہا مقابلہ کررہا تھا۔ اگلے سال برطانیہ کو ایک شرمناک شکست ہوئی۔ پروشیا (Prussia) متحدہ محاذ سے

الگ ہوگیا۔ اس کے ایک سال بعد اسپین نے بھی اس کی تقلید کی۔ چند برسوں کے اندر ہی انگلینڈ تنہا فرانس سے مقابلہ کررہا تھا، جب کہ اکثر یوروپی طاقتیں یا تو فرانس کی پشت پناہی کررہی تھیں یا غیر جانبدار تھیں۔ 1797 میں اٹلی سے نکالے جانے اور نپولین کے ذریعے حملے کی دھمکی ملنے کے بعد، آسٹریا نے نہ صرف یہ کہ لڑائی سے کنارہ کشی اختیار کرلی بلکہ جمہوریہ وینس کے علاقوں کو بھی فرانس کے سپرد کردیا۔ جب نپولین 1797 میں اٹلی سے واپس ہوا تو اس نے دیکھا کہ 60,000 فرانسیسی فوجیں برطانیہ پر حملے کے لیے تیار کھڑی ہیں۔ ایک عالمی سلطنت کے اپنے خواب کے ساتھ اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ برطانیہ پر حملہ کرنے کے بجائے اب اس نے مصر کو فتح کرنے اور اسے ہندوستان پر حملے کے لیے بنیاد بنانے کی فکر کی۔ نپولین نے سوچا کہ مصر کو فتح کرنے کے بعد وہ یونان اور بلقان یوروپ میں عیسائیوں کی مدد حاصل کرلے گا اور قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے گا تاکہ یوروپ پر پیچھے سے حملہ کیا جاسکے۔

بحیرۂ روم کو ایک ''فرانسیسی جھیل'' تصور کرنے والے نپولین نے نیلسن کی ماتحتی میں برطانوی بحریہ کے نقل وحمل کی توقع بھی نہیں کی تھی۔ اس نے جون 1798 میں تولن (Toulon) سے اپنے سفر کا آغاز کیا، مالٹا پر اپنا تسلط قائم کیا، بحیرۂ روم کو عبور کیا اور یکم جولائی 1798 کو مصر کے ساحل پر پہنچا۔ اس نے جبراً اسکندریہ پر قبضہ کیا اور صحرا کے دوسری طرف پیش قدمی کی۔ مصریوں نے اپنے کنوؤں کو پتھروں سے بھردیا تھا تاکہ حملہ آوروں کو پانی تک نصیب نہ ہو۔ فرانسیسیوں نے کسی طرح پیش قدمی کی اور جنگ اہرام میں مملوک کی فوجوں سے مقابلہ کیا اور کیرو (Cairo) پر قبضہ کرلیا اور یہ سب اس نے مصر میں اپنی آمد کے صرف تین ہفتوں کے اندر ہی حاصل کرلیا۔

کسی طرح نیلسن بھی مساوی رفتار کے ساتھ بحیرۂ روم میں گشت لگا رہا تھا۔ ایک زبردست تعاقب کے بعد اس نے فرانسیسی بیڑے کا نشان پالیا جو اسکندریہ سے پندرہ میل جزیرۂ ابوکیر اور نیل کے Rouzetta دہانے کے درمیان خود کو کافی محفوظ سمجھ رہے تھے۔ جس وقت نپولین اسلامی پیشواؤں کے ساتھ ان کی مدد حاصل کرنے کے لیے بات چیت کررہا تھا۔ نیلسن کے جہازی بیڑے نے ایک ایک کرکے فرانسیسی بحریہ پر حملہ کیا اور راتوں رات ان کے تمام جہازوں کا صفایا کردیا۔ فرانسیسی بحریہ کا سپہ سالار مارا گیا، اس کے جہازی بیڑے کو کچل کررکھ دیا گیا۔ غرض نیل کی لڑائی نے لہروں کا رخ بدل دیا۔

مصر کے حالات پر اب نپولین کی بالادستی نہیں رہ گئی تھی۔ کیرو کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے، اور ترکوں، مصر کے سربراہوں نے ایک فوج جمع کی اور نپولین پر حملہ کردیا۔ وہ کیرو کو کچلنے میں کامیاب ہوگیا اور شمال مشرق کی جانب پیش قدمی کی۔ وہ جافا سے گزرتے ہوئے اکرا (Accra) کے بندرگاہ تک پہنچا۔ یہاں پر اس کی افواج میں طاعون پھیل گیا۔ اسی دوران برطانوی جہازی بیڑا ترکوں کو نپولین کے طاعون زدہ افواج کے محاصرے سے آزاد کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ اس طرح 20 مئی 1799 کو نپولین محاصرہ ختم کرنے پر مجبور ہوا۔ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے کا اس کا خواب ماضی کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ ابوکیر کی طرف واپس لوٹا اور فتح حاصل کی۔ اس سے اس کی انا کو تسکین ملی۔ برطانوی بیڑے کی نظر بچا کر، مختصر سے پیروکاروں کے ساتھ وہ تیزی کے ساتھ فرانس کی طرف واپس ہوا اور اکتوبر 1799 میں وہاں پہنچا۔ گنگا کے کناروں پر جھنڈا لہرانے کا نپولین کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

فرانسیسی مدد پر مبنی ٹیپو کے منصوبے ناکام ہوگئے۔ صرف سو فرانسیسی فوجی ٹکڑیاں منگلور پہنچیں، ٹھیک اسی وقت ایک نئے برطانوی گورنر جنرل لارڈ مارننگٹن ویلزلی نے اپریل 1798 میں مدراس کے ساحلوں پر قدم رکھا۔ یہ قیاس کرتے ہوئے کہ فرانسیسی فوجیں 1799 کے نصف سے قبل ہندوستان نہیں پہنچ سکتیں ویلزلی نے تیزی کے ساتھ پیش قدمی کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1798 کے اواخر میں وہ مدراس کی طرف بڑھا۔ وہ ٹیپو سے اس بات کی واضح یقین دہانی چاہتا تھا کہ یا تو وہ فرانس کے ساتھ دوستی سے دست بردار ہوجائے یا پھر اسے برباد کردیا جائے گا۔ ٹیپو نے وقت کے ساتھ چلنے میں ہی عافیت سمجھی۔ لیکن فروری 1799 میں انگریزوں نے میسور پر حملہ کردیا۔ انگریزی فوجوں نے ٹیپو کی فرمانروائی میں شمال کی جانب کو چھوڑ کر سبھی طرف سے پیش قدمی کی اور بیس لاکھ روپئے اور ٹیپو کی آدھی سلطنت کی مانگ کی۔ ٹیپو نے انکار کردیا۔ فوجیں آگے بڑھیں اور اس کی دارالحکومت سرنگا پٹنم کا محاصرہ کرلیا۔ انھوں نے ٹیپو کی فوجوں کو شکست دی۔ سرنگا پٹنم کو فتح کرلیا گیا۔ ٹیپو سلطان خود نہایت دلیری کے ساتھ لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کی سلطنت انگریزوں، مراٹھوں اور نظام کے درمیان کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی جس میں سے ایک معمولی حصہ اس ہندو راجا کے ورثا کو دے دیا گیا جسے حیدرعلی نے بے دخل کردیا تھا، آرتھر ویلزلی نے لکھا:

''ہمارا اہم ساتھی، نظام دوبارا ہمارے پاس واپس آگیا۔ جزیرہ نما ہندوستان میں پروان چڑھ رہی فرانسیسی ریاست کو برباد کردیا گیا، ہمارا خطرناک دشمن اور ہندوستان میں فرانسیسیوں کا قابل اعتماد ساتھی ٹیپو سلطان نیست ونابود کردیا گیا۔''

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی خودمختاری کے استحکام کے لیے اب راستہ صاف تھا۔ □□□

فرحت اللہ بیگ

# پٹنا

کہتے ہیں کہ "دیوانہ را ہوئے بس است۔" اب اس مضمون کی حد تک دیوانہ آپ مجھے فرض کر لیجیے اور "ہو" اس تحریر کو سمجھ لیجیے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے "پٹنے" کے متعلق کی ہے۔ انکی یہ تحریک پڑھ کر مجھے جوش ہی تو آگیا کہ اپنے کسی "پٹنے" کی مشق کرنا بھی ایک لازمی امر ہے۔ یقین مانیے کہ اگر مجھے پہلے سے اس کی اہمیت معلوم ہوتی تو کسی نہ کسی طرح دو چار واقعات اپنے اوپر ضرور نازل کر لیتا۔ فی زمانہ بھی میں نے بہت کوشش کی کہ خیر جب نہیں پٹے تو اب پٹ جاؤ — مضمون تو لکھ لوگے۔ مگر کیا کیا جائے کہ باوجود ایسی کاروائیاں کرنے کے، جو ایک بھلے آدمی کے پٹ جانے کے لیے بالکل کافی ہوسکتی ہیں۔ میری یہ مراد کسی طرح بر نہ آئی۔ اب ایک ہی صورت رہ گئی ہے کہ مرزا عظیم بیگ صاحب یا کسی اور مزاحیہ نویس صاحب کو دعوت دی جائے کہ وہ یہاں تشریف لائیں تا کہ ان سے پانی میں ایک ایک دو دو چونچیں ہو جائیں۔ اس کے بعد یقین ہے کہ اگر میرا مضمون پورا نہ بھی ہوا تو انشاء اللہ ان کا مضمون ضرور کمپلیٹ ہو جائے گا۔ اس لیے:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
اے مرد مان بکوشید تا جامۂ زنان نہ پوشید

ہاں ایک شرط ہے اور وہ بڑی ٹیڑھی شرط ہے۔ یعنی یہ کہ جو صاحب اس مضمون کی تلاش میں بہ خرچۂ خود یہاں آئیں وہ اپنے نجیب الطرفین ہونے کا باضابطہ رجسٹری شدہ سارٹیفکیٹ لے کر آئیں کیونکہ میں کہے دیتا ہوں کہ میں کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے ہاتھ سے پٹنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس سارٹیفکیٹ کے ساتھ ہی کسی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا دیا ہوا "اجازت نامہ خودکشی" بھی شریک رہنا چاہیے۔ کیونکہ ایک مرزا جی کے ہاتھ کی مار کسی مارواڑی کی توند تو ہے نہیں کہ آواز تو آئے "دھن" سے اور چوٹ لگے کسی سڑے ہوئے تربوز کی۔

بہر حال جو کوئی آئے وہ پوری طرح تیار ہو کر آئے اور ایسی شکل میں آئے کہ مرد اور عورت کی بہ آسانی تمیز ہو سکے تا کہ پٹ جانے کی صورت میں یہ نالہ و فریاد بلند نہ ہو کہ "دور موئے تو مرد ذات ہو کر میر بائی پر ہاتھ اٹھاتا ہے۔"

عربی کی ایک مثل مشہور ہے کہ کُلُّ یَرْجِعُ اِلیٰ اَصْلِه جس کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگو! کسی کام کو اختیار کرنے سے پہلے اس کی اصلیت کو معلوم کرلو۔ اس لیے قبل اس کے کہ میرا چیلنج قبول کیا جائے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ لفظ "پٹنے" کی ترتیب اس کی تعریف اور اس کی تاریخ سے ہر کہہ دمہ کو آگاہ کردوں کہ جس طرح ارکانِ مذہب کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ان کی ادائی میں مزہ آتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ شخص جس پر "پٹنے کا عمل" ہونے والا ہے، بروقت وقوع واقعہ، اس سے پوری طرح لذت اندوز ہو سکے۔

پس جاننا چاہیے کہ علم مجبوریات میں ایک ٹھیٹ ہندی لفظ ہے اور قواعد اردو مولفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو حیدر آباد دکن کی رو سے یہ فعل متعدی مجہول یعنی یہ کہ اس فعل کا عمل ہمیشہ بے وقوفوں پر ہوتا ہے۔ اور یہ صرف اسی قوم اور ملک کے لغات میں پایا جاتا ہے جو کسی زبردست خاں کے زیر اثر ہوتا ہے یا ہوتی ہے یا ہوتے ہیں۔ اردو کے علاوہ ہم خدا کے فضل سے فارسی اور عربی بھی جانتے ہیں لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے فارسی زبان میں ایسے معنی دینے والا کوئی مصدر نہیں ہے۔ وہاں اس کے بجائے لفظ "کشتہ شدن" استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ جن ملکوں میں زبان فارسی رائج ہے وہاں ایسا کوئی بے غیرت نہیں ہوتا کہ سر بازار یا زیادہ سے زیادہ دیوار کی آڑ میں پٹے اور پھر رسالوں میں اپنے پٹنے کی جواں مردی کا غلغلہ بلند کرے۔ وہاں جب پٹنے کی صورت پیش آتی ہے تو دو میں سے ایک "کشتہ شدن" ہو جاتا ہے۔ اب رہی عربی تو بھلا اس زبان میں یہ منحوس لفظ کیوں آنے لگا۔

بہادر عربوں نے اپنے اپنے ہاں ذرا پہلو بدل کر ایک مصدر "ضرب زید عمروا" ایجاد کیا ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ "کرے گا کوئی اور پٹے گا دہی" یہ ایک ایسا وسیع المعنی مصدر ہے کہ ہر فاتح قوم نے اس کو اپنی زبان میں لے کر اس پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اب ہر فاتح قوم کی معمولی سے معمولی غلطی کا خمیازہ مفتوح "قومچہ" کو اٹھانا پڑتا ہے۔

مثلاً میم صاحب سے پٹ کر اگر کوئی صاحب اپنا غصہ بذریعہ ولایتی جوتے کے عبداً کسی قلی کے "بین القلب والترائب" پر اتاریں اور اس طرح وہ نالائق اپنی تلی پھٹ جانے دے تو ویسی صورت میں اس ولایتی جوتے کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بلکہ سارا قصور اس تلی کا ہے جو ایک ٹھوکر کی بھی تاب نہ لا سکی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ہر مذہبی ملک کی عدالت "ضرب زید عمروا" کے حاصل مصدر کو پیش نظر رکھ کر یقیناً "ولایتی جوتے اور ملزم" دونوں کو بری کرے

گی۔ یہ تو ہوئی پٹنے کی ترکیب۔ اب اس کے بعد اس کی تعریف کو لیجیے۔

فلسفہ میں ''پٹنا'' اس مسئلے کو کہتے ہیں جس کا صغریٰ جوتی اور کبریٰ لکڑی ہو اور جس کا نتیجہ چاند کی صفائی نکلے، خواہ وہ چکنائی کی صورت میں یا جھنڈارہ پھوٹ جانے کی شکل میں۔ سائنس میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ ایک جسم کے جوارح کی گردش سے ہوا کا جو تموج پیدا ہو کر دوسرے جسم پر ختم ہو اور اس دوسرے جسم کی رنگت کو مائل بہ سرخی کر دے ''پٹنا'' کہلائے گا۔ طب میں ''پٹنے'' سے مراد جسم کا وہ ابھار ہے جو مومیائی کھائے اور ہلدی چونا ملے بغیر دفع نہ ہو سکے۔ معاشرت خانگی میں یہ لفظ بوجہ کثرت استعمال تعریف سے مستثنیٰ ہو گیا ہے اور ارتقا تہذیب کے لحاظ سے گو اس کی صورتیں بدل جاتی ہیں۔ مگر معنی میں تغیر نہیں ہوتا۔ مثلاً اگر کسی پانسو پانے والے انگریز نما ہندوستانی کی جنٹلمین بیوی بازار سے ایک ہزار کا سامان ایک دم خرید لائیں تو گو تھرڈ کلاس لوگ اس کو ''چاند ہونا'' کہیں گے۔ لیکن مہذب سوسائٹی میں ہمیشہ اس واقعہ کا اظہار ''پٹ'' جانے سے کیا جائے گا۔ بہرحال ہماری روزمرہ کی زندگی میں یہ لفظ ایسا عام ہو گیا ہے کہ امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل، موٹا ہو یا دبلا، لمبا ہو یا ٹھگنا، کالا ہو یا گورا، اس کے استعمال سے پوری طرح واقف ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ شریفوں میں اس ''پٹنے'' کے اثرات میاں پر اور رذیلوں میں بیوی پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور زمانۂ موجودہ کی تہذیب میں انھیں مائل بہ سرخی اثرات کو دیکھ کر انسان کی شرافت اور رذالت کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق لغت کے لیے لازمی ہے کہ اس لفظ کے متعلق یہ بھی غور کیا جائے کہ اس کی ابتدا کیوں کر ہوئی ہے۔ لفظ ''پٹنا'' میں ''نا'' تو مصدر کی علامت ہے۔ اب رہ گیا ''پٹ'' تو اس کے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ یہ ''حرف صوت'' ہے اور یہ وہ آواز ہے جو کسی بیوی کی پھکنی یا دست پناہ میاں کی کمر پر پڑنے سے پیدا ہوتی ہے اور چونکہ متمدن انسانوں میں یہ آواز اکثر گھروں سے آیا کرتی تھی اس لیے دوسروں کو اس واقعہ کی اطلاع دینے کی غرض سے اس آواز کو مصدر کی شکل بنانا پڑا تا کہ لفظ ''پٹنا'' کے کہتے ہی سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ فلاں گھر میں پھکنی اور کسی جسم انسانی کا اتصال ہو رہا ہے یا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ نے عمومیت کی شکل اختیار کی اور ایسی کارروائیوں کے متعلق جو دو ہستیوں میں اختلاف ہو جانے کی صورت میں رونما ہوتی ہیں اس کا استعمال ہونے لگا۔

اگر اس لفظ کی تاریخ کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کچھ پٹنے ہی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ بچپن میں رونے پر پٹتا ہے۔ لڑکپن میں نہ پڑھنے پر پٹتا ہے، جوانی میں شادی کر کے پٹتا ہے۔ بڑھاپے میں دادا نانا بن کر پٹتا ہے۔ اور کہتے ہیں اگر مرنے کے بعد بھی اس پٹنے کا سلسلہ مختلف وجوہ اور نئی نئی شکلوں میں جاری رہنے والا ہے۔ جہاں تک منقولی شہادت مل سکی ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ پٹنے کی ابتدا ایک بڑے فرشتے سے ہوئی ہے۔ یعنی سب شاگردوں نے مل کر اپنے استاد کو ٹھونک دیا۔ اس سے دو نتیجے نکلتے ہیں اول یہ کہ استاد جو شاگردوں کو پیٹتے ہیں تو وہ درحقیقت اسی گستاخی کا بدلہ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کو مار بیٹھے تو اس کا یہ فعل قابل ملامت نہیں بلکہ قابل تعریف ہے۔ کیونکہ ایسا کرنا افعالِ انسانی سے بڑھ کر فرشتوں کا فعل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے میں بھی ایک فرشتہ بن چکا ہوں۔

میں مڈل میں پڑھتا تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر صاحب ترقی پا کر دوسری جگہ چلے گئے اور ان کی جگہ ایک دوسرے ''حضرت'' تشریف لائے۔ نام تو ان کا برکت رام تھا لیکن بلحاظ اپنی ''چگی داڑھی'' کے ''بکرت اللہ'' کہے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ننھی سی داڑھی سے طالب علم کیوں ڈرنے لگے۔ ان کا گھنٹہ شروع ہوا اور کلاس مکتب بن گئی۔ برابر ہی ہیڈ ماسٹر صاحب کا کمرہ تھا۔ وہ تھے صاحب بہادر اور بہت کڑوے مزاج کے آدمی۔ دو ایک روز تو ذرا چپ رہے۔ مگر جب اس ''ہوحق'' کا سلسلہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا ہی گیا تو ایک دن صاحب نے بکرت اللہ صاحب کو بلا کر خوب ڈانٹا، یہ غصہ میں بھرے کلاس میں آئے۔ جاتے وقت ایک سوال دے گئے تھے۔ ہم نے حل کر لیا تھا۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی ہم نے بنچ سے اٹھ خوشی خوشی جا سلیٹ ان کے سامنے کر دی۔ یہ جلے ہوئے تو تھے ہی، نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ زور سے ایک ''لپڑ'' رسید کیا۔ ہم روز اول سے استادوں کو مارنا سیکھے ہوئے تھے۔ ادھر انھوں نے ہم کو لپڑ دیا اور ادھر ''مسٹر بکرت اللہ'' کے پیٹ میں اس زور کا مکا پڑا کہ بچارے پیٹ پکڑ کر وہیں بیٹھ گئے، یہ کچھ نہ پوچھو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ دریافت ہوئی، شہادتیں لی گئیں اور جو فیصلہ آسمان پر ہوا وہی زمین پر ہوا۔ یعنی فرشتے اپنی جگہ پر رہے اور ان کے استاد نکالے گئے۔ خیر تو یہ ایک واقعہ معترضہ تھا، اب اصلی بحث کو لیجیے۔

تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میاں بیوی میں اس ''پٹنے پٹانے'' کا آغاز کب سے ہوا۔ نسل انسانی کے ابتدائی جوڑے کے خانگی تعلقات کے متعلق کوئی صحیح روایت ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات ایسے واقعے پیش آتے ہیں کہ شریف سے شریف انسانوں میں بھی اس پر خانہ جنگی ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ سب سے بڑا جھگڑے کا جھونپڑا تو وہی جنت والا معاملہ تھا۔ آپ خود ہی غور کیجیے کہ کسی میاں کے رزق کا دروازہ اگر محض بیوی کی غلطی سے بند ہو جائے تو ان حضرت کو کیا کچھ تاؤ نہ آئے گا۔ اور فطرت

انسانی کا لحاظ کرتے ہوئے اس تاؤ کا نتیجہ کیا کچھ نہ نکلے گا۔ جھگڑے کے دوسرے مواقع ان کے ہاں اولاد پیدا ہونے کے بعد سے پیش آنے لازمی تھے اور ضرور پیش ہوئے ہوں گے۔ کیا ہمارا مشاہدہ نہیں ہے کہ جب گھر میں دو بچے ہوتے ہیں، وہاں جس بچے کو میاں چاہتے ہیں۔ اس کو بیوی نہیں چاہتی اور جس کو بیوی چاہتی ہے اس کو میاں نہیں چاہتے۔ اور یہی اختلاف "جاہلیت" اکثر خطرناک صورتیں پیدا کردیتا ہے۔ پھر بھلا جس گھر میں دن کو ایک اور رات کو ایک بچہ پیدا ہوتا ہوگا وہاں اراکین خاندان مشترکہ میں کیا کچھ "اختلاف" نہ ہوگیا ہوگا۔ لیکن چونکہ اس مادہ میں کوئی عینی شہادت نہیں ہے۔ اس لیے اس پر عقل آرائی کرنی اور قیاس سے کام لینا روایت کے خلاف ہے۔ مگر پھر بھی اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خانہ جنگی کا تخم ہماری فطرت میں ابتدا ہی سے بویا گیا ہے اور بات بھی یہ ہے کہ گھر میں اگر اس قسم کی داتا کلکل نہ ہوئی تو وہ گھر کا ہے کو ہوا قبر ہوگیا۔

اس کے بعد سے "پٹنے" کے متعلق تاریخی شہادت برابر ملتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ اس بارے میں پہلا تاریخی واقعہ ہابیل اور قابیل کا جھگڑا ہے۔ یہ تو معلوم نہیں کیا ہوا؟ جھگڑے کی وجہ کیا تھی؟ اور عموماً جھگڑے کی وجہ معلوم بھی نہیں ہوتی اور اگر معلوم ہوتی بھی ہے تو وہ اکثر غلط ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ سے "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مصدر عالم وجود میں آگیا۔ اس کے بعد کے واقعات اگر معلوم کرنے ہوں اور اس مصدر کے مشتقات دیکھنے ہوں تو ملاحظہ ہو تاریخ عالم مولفہ مولوی فطرت اور مسٹر ضرورت۔

اس قدر سننے اور سمجھنے کے بعد ہے کوئی باہمت جو میرے سامنے میدان میں آئے اور نعرہ لگائے کہ

میوہ منم دخت افراسیاب
برہنہ ندیدہ تنم آفتاب

□□□


## انیس کے سلام

### مرتبہ: علی جواد زیدی

انیس کے سلاموں کا یہ پہلا جامع مجموعہ ہے جس میں انیس کے تمام مطبوعہ اور کچھ غیر مطبوعہ سلام شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ انیس کے نوحے، ایک مناجات، ایک متفقی مخمس اور کچھ تضمینیں بھی شامل ہیں۔ سلاموں کی تعداد 102 ہے جن میں تحت اللفظ 44 اور سوز کے 58 سلام ہیں۔ انیس کے سلاموں کا یہ مجموعہ سید علی جواد زیدی نے مرتب کیا ہے۔ مقدمے میں انھوں نے نہ صرف اردو میں رثائی شاعری کی پوری تاریخ بیان کردی ہے بلکہ ہر دور میں اس صنف شاعری کے قابل لحاظ نمونوں کی خصوصیات بھی واضح کی ہیں۔

صفحات: 307، قیمت: -/60 روپے

## انشا کا ترکی روزنامچہ

### مصنف: انشاء اللہ خاں انشا

انشاء اللہ خاں انشا اپنے زمانے کے مستند شاعر اور کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ یہ روزنامچہ جو سعادت علی خاں کے دربار سے ان کی وابستگی کے دنوں کی یادگار ہے، ترکی زبان کے اس لہجے میں لکھا گیا ہے جو "چغتائیہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ڈاکٹر نعیم الدین نے یہ ترجمہ براہ راست ترکی زبان سے کیا ہے اور مقدمے میں اس کی لسانی خصوصیات اور اس کے مندرجات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

صفحات: 68، قیمت -/4.50 روپے

## اردو کی نثری داستانیں

### مصنف: گیان چند جین

اردو میں جو نثری داستانیں قلمبند کی گئی ہیں، ان کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کرجاتی ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کی یہ کتاب تمام دستیاب نثری داستانوں کا تعارف بھی ہے اور ان پر تنقیدی محاکمہ بھی۔ مختلف داستانوں کے فنی مدارج اور اس فن کے عہد بہ عہد ارتقا پر بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 906، قیمت: -/276 روپے

## اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب

### مصنف: گوپی چند نارنگ

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی اور علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہے۔ لسانیات، اسلوبیات، اساطیر، کتھا کہانی، فکشن، ادبی تھیوری، مابعد جدیدیت اور ادب شناسی میں مقامیت کے مباحث ہوں یا اردو کے پرانے اور نئے، نثر اور نظم کے نمائندہ فن کاروں کے انفرادی کارناموں کی قدر شناسی، نارنگ صاحب کے کاموں کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہندوستانی ذہن و تہذیب کے ان سرچشموں کی نشاندہی کی ہے جن کی آبیاری سے اردو غزل سرسبز ہوئی۔

صفحات: 463، قیمت: -/250 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: کملیشور
ترجمہ: خورشید عالم

# آزادی مبارک

ہوا یہ کہ میں منٹو کے ساتھ گھومنے نکل پڑا۔ موقع ہی ایسا تھا۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ منانے کا موقع۔ یہ تو نہیں معلوم کہ ملک کون سا تھا، لیکن اتنا معلوم تھا کہ دو ملکوں میں سے کوئی بھی ایک ہوسکتا تھا، بھارت یا پاکستان۔ کیونکہ پچاس سال پہلے ایک ہی ملک دو ٹکڑوں میں آزاد ہوا تھا۔ ایک انڈیا، دیٹ از بھارت اور دوسرا پاکستان۔

تو آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر منٹو سے ملنا لازمی تھا، کیونکہ پچاس برس پرانی اس تہذیب کا اصل عالم اور مورخ صرف منٹو ہی ہے۔ ایک ایسی تہذیب جس نے لہو کی دیواریں اور آنسوؤں کی ندیاں ایجاد کی تھیں۔

منٹو کو دیوندر اسر اور بلراج مینرا جانتے ہیں۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ جانتا ہے۔ اگر تم نہیں جانتے تو بدنصیب ہو۔ ہمارے تمھارے درمیان یہ کہاسنی تو چلتی ہی رہتی ہے۔ تو خیر۔۔۔

تو ہم لارنس باغ، نہیں نہیں جناح باغ والے علاقے میں ہی کہیں تھے۔ سامنے تھوڑی دور پر لہو کی ایک گیلی دیوار اب بھی کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں نے پوچھا۔

— منٹو صاحب! ''کیا بے خبری کا فائدہ'' والا حادثہ یہیں ہوا تھا؟

— ہاں، یہیں کہیں'' ۔۔۔ لہو کی دیوار کے اس پار یا اُس پار۔۔۔ اس حادثے میں جو بچہ موجود تھا، اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو وہ اب پچپن سال کا ہوگا۔ حادثے کے وقت وہ پانچ سال کا تھا۔

تبھی ایک پچپن سالہ آدمی رک کر منٹو کو دیکھنے لگا۔

— اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟

— جی، آپ کو دیکھ رہا ہوں۔۔۔ کیونکہ آپ کی اس کہانی کا بچہ میں ہی ہوں اور اتفاق سے ابھی تک زندہ ہوں!

— یہ تو تعجب کی بات ہے۔۔۔ کہتے ہوئے منٹو نے مجھے اور پھر اس پچپن سالہ شخص کو بڑی بڑی آنکھوں سے حیرانی سے دیکھا۔ اس شخص نے ہم دونوں کو خاموش دیکھا۔۔۔

تو وہ پچپن سالہ شخص درمیان میں بول پڑا—

— مجھے آپ کی وہ کہانی اب تک یاد ہے— ''بے خبری کا فائدہ۔

— تم نے کبھی پڑھی؟

— جب میں بارہ تیرہ سال کا تھا۔ اس وقت گھروں میں آپ کی کہانیوں پر پابندی لگی ہوئی تھی کیونکہ آپ ترقی پسند تھے۔۔۔ اور ترقی پسندوں میں آپ پر پابندی لگی ہوئی تھی کیونکہ آپ ادب اور انسان پرست تھے۔۔۔ آپ کے بارے میں یہی بتایا تھا لوگوں نے۔۔۔

منٹو کی بڑی بڑی آنکھیں اور باہر نکل آئیں۔ وہ حیرت سے بولے — عجب انسان ہو تم۔۔۔ اس تہذیب میں پلے بڑھے ہو پھر بھی کہانیاں پڑھتے ہو؟

— وہ تو اس دور میں پڑھ لی تھی، اب نہیں پڑھتا۔ آپ کی کہانی تو مجھے زبانی یاد ہے۔۔۔ سناؤں۔۔۔

— میری دلجوئی کے لیے تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔

— نہیں۔۔۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا! سن لیجیے۔۔۔ اور اس نے کہانی سنانی شروع کردی۔

لبلبی دبی۔ پستول سے جھنجھلا کر گولی باہر نکلی۔

کھڑکی سے جھانکنے والا آدمی اسی جگہ دوہرا ہوگیا۔

لبلبی تھوڑی دیر کے بعد پھر دبی۔ دوسری گولی بھنبھناتی ہوئی باہر نکلی۔

سڑک پر ماشکی کی مشک پھٹی۔ اوندھے منہ گرا اور اس کا لہو مشک کے پانی میں مل کر بہنے لگا۔

لبلبی تیسری بار دبی۔ نشانہ چوک گیا۔ گولی ایک گیلی دیوار میں جذب ہوگئی۔

چوتھی گولی ایک بوڑھی عورت کی پیٹھ میں لگی — وہ چیخ بھی نہ سکی اور وہیں ڈھیر ہوگئی۔

پانچویں اور چھٹی گولی بیکار گئی۔ نہ کوئی ہلاک ہوا نہ زخمی۔

گولیاں چلانے والا بھنّا گیا۔ اسی وقت سڑک پر ایک چھوٹا سا بچہ دوڑتا دکھائی دیا۔

گولیاں چلانے والے نے پستول کا منہ اس کی طرف موڑ دیا۔

اس کے ساتھی نے کہا— یہ کیا کرتے ہو؟

گولیاں چلانے والے نے پوچھا— کیوں؟

— گولیاں تو ختم ہوچکی ہیں!

— تم خاموش رہو، اتنے سے بچے کو کیا معلوم؟

— کہانی سنا کر وہ پچپن سالہ شخص داد و تحسین پانے کے لیے منٹو کو دیکھنے

لگا— یہ تو وہی کہانی!

— یہ تو وہی! کہتے ہوئے منٹو نے میری طرف دیکھا۔

— قریب قریب ایسا ہی کوچہ کنڈے والان میں ہوا تھا۔ ارے وہی اجمیری گیٹ کے پاس، جہاں وشنو پربھاکر رہتے ہیں۔۔۔ ہوا یہ تھا کہ ایک اندھیری گلی کے سنسان موڑ پر ایک آدمی پستول چھپائے کھڑا تھا۔ جی بی روڈ کا ایک مسافر سکینہ بائی کے ساتھ آدھی رات گزار کر واپس جا رہا تھا۔ موقع پاتے ہی اس آدمی نے پستول مسافر کے سینے پر رکھ دی اور دبی آواز میں چیخا—

— جو کچھ ہے میرے حوالے کر دو!

اور کوئی چارہ نہیں تھا، پستول سینے پر تھی۔ چیخنے چلّانے کا موقع بھی نہیں تھا۔ سکینہ بائی سے جو پیسے بچے تھے وہ، ساتھ ہی سونے کی چین اور گھڑی بھی مسافر کو اتارنی پڑی۔

— کچھا پہنے ہے؟ پستول والے نے دبی آواز میں کڑک کر پوچھا۔

— کیوں؟ مسافر نے ڈرتے ہوئے سوال کیا۔

— پینٹ اتار دے!

مسافر گھبرایا—

— پینٹ۔۔۔

— ہاں، وہاں بھی تو اتاری ہوگی! اتار! پستول والے نے دھمکی دی۔

کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پینٹ بھی اتار دی۔

پستول والے نے سامان سمیٹا اور چلنے لگا۔

— اے بھائی۔۔۔ یہ طمنچہ ہمیں دے دو۔۔۔

— کیوں کیا کرے گا۔۔۔ اس کی لبلبی خراب ہے اور نلی بھی۔۔۔

— تو کیا ہوا۔۔۔ اس میں خوف تو ہے!

پستول والا ہنسا اور طمنچہ پھینک کر چلا گیا۔

مسافر نے طمنچہ اٹھایا اور اس اندھیری گلی کے اسی موڑ پر کسی اور کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا!

— انتظار کا یہ سلسلہ آزادی کے دن سے جاری ہے! منٹو نے کہا اور خراماں خراماں چلنے لگے۔

کچھ ہی گز کے فاصلے پر ایک جلی ہوئی دوکان دکھائی دی۔ اس کے اندر ایک آدمی برف کی دو موٹی موٹی سلیں رکھے بیٹھا تھا۔ منٹو کو جیسے ہی کچھ یاد آیا تو پچپن سالہ شخص نے یاد دلایا— یہ وہی دوکان ہے منٹو صاحب جو آپ نے تب بھی دیکھی تھی۔

منٹو بے ساختہ بولے — تب جو میں نے کہا تھا وہی آج بھی کہہ سکتا ہوں۔ آخر جلی ہوئی اس دوکان کو کسی طرح ٹھنڈک پہنچ ہی گئی!

کہتے ہوئے منٹو کی آنکھوں میں سرد کہرا سا ابھر آیا۔

میں نے چلتے چلتے کہا— منٹو بھائی، کہیں ایک پیالہ کافی ہو جائے۔۔۔

— ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ لیکن کچھ اور ہوتا تو۔۔۔

— وہ بھی ممکن ہے۔۔۔

— کیا میں آپ لوگوں کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ پچپن سالہ شخص نے پوچھا۔

— ہاں، ہاں آؤ۔۔۔ تم تو اس پچاس سالہ آزادی کے چشم دید گواہ ہو۔۔۔ کہتے ہوئے منٹو نے یکبارگی اس کے ماتھے کو دیکھا۔

— میاں، تمھارے ماتھے پر زخم کا یہ گہرا نشان۔۔۔

— جی یہ 1984 میں لگا تھا۔۔۔

— 1984 میں! منٹو نے حیرت سے پوچھا— 1984 سے تمھیں کیا لینا دینا؟ اس سال تو اندرا گاندھی کا قتل ہوا تھا۔۔۔ اور سکھوں کا قتل عام۔۔۔

— جی میں اسی قتل عام میں پھنس گیا تھا۔۔۔

— تم اس میں۔۔۔ تم اُس میں کیسے پھنس گئے؟ منٹو نے اور زیادہ حیرانی سے پوچھا۔

— جی، وہ جیت آپا ہیں نا۔۔۔

— جیت آپا! تم تو راولپنڈی کے ہو، لیکن وہ قتل عام تو دلّی میں ہوا تھا۔

— جی، وہ تو ہے، لیکن جیت آپا بھی راولپنڈی کی ہیں۔۔۔ قدیمی طور پر۔۔۔ پارٹیشن میں انھیں دلّی بھاگنا پڑا تھا۔ ان کے ماتھے پر بھی زخم کا اتنا ہی گہرا نشان ہے۔۔۔

— پہیلیاں مت بجھاؤ۔۔۔

— جی، یہ پہیلی نہیں حقیقت ہے۔۔۔ جیت آپا کے ماتھے پر نشان ہے وہ 1947 میں لگا تھا! اس پچپن سالہ شخص نے کہا۔

ہم دونوں اس پچپن سالہ شخص کی باتوں میں الجھ گئے تھے، تو منٹو نے کہا

— تم ان پچاس برسوں کے گواہ ہو۔۔۔ جو کچھ ہوا وہ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔۔۔ یہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ تمھاری کسی جیت آپا کو کوئی زخم تقسیم کے دوران لگا ہو، لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تم 1984 کے قتل عام کے دوران راولپنڈی سے دلّی کیسے پہنچ گئے۔۔۔؟

— ادیب اعلیٰ! ملک ٹوٹ سکتے ہیں، یادیں نہیں ٹوٹتیں۔۔۔ لہو کی بے شمار دیواریں کھڑی ہوسکتی ہیں، مگر دیواریں آواز کو تو نہیں روک سکتیں۔۔۔ الفاظ کا فرق ہوسکتا ہے، لیکن میں پاکستان میں مہاجر تھا اور جیت آپا ہندوستان میں شرنارتھی۔۔۔ میرا چھوٹا سا کنبہ کرنال ہریانہ سے راولپنڈی پہنچا تھا اور

جیت آپا کا کنبہ راولپنڈی چھوڑ کر دلی۔ تب میں پانچ سال کا تھا اور جیت آپا کی عمر شاید چھ سال رہی ہوگی۔ شاید کنبے والی بات میں غلط کہہ گیا۔ جیت آپا کے کنبے میں کل 21 لوگ تھے۔ راولپنڈی سے تین میل باہر تھی جیت آپا کی بستی۔ ڈھیری۔ وہاں ان کے اینٹوں کے بھٹے تھے، جن پر پچیس تیس مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ ان کے بھٹے اول نمبر کی اینٹوں کے لیے مشہور تھے۔ دوئم نمبر کی اینٹوں کو توڑ کر مٹی میں بدل دیا جاتا تھا۔

— اتنا خیال تھا انھیں کوالٹی کنٹرول کا؟

جی ہاں، آنچ کم نہ ہونے پائے، اس کی ناپ بھٹیوں کے دہانوں سے ہر گھنٹے کی جاتی تھی۔ دہانوں پر لوہے کے توے پڑے رہتے تھے اور آنچ سہتے سہتے پپڑی دار ٹھیکریوں جیسے لگنے لگے تھے۔ انھیں میں پڑے کنڈوں کو لوہے کی ٹیڑھی بلیوں سے اٹھا اٹھا کر آگ کی دہک کو ناپا جاتا تھا۔۔۔ ضرورت پڑتے ہی بھٹیوں میں لکڑیاں جھونکی جاتی تھیں۔۔۔ سردیوں میں قبائلی بنجارے بھٹیوں کے پاس ہی ڈیرے ڈالتے تھے۔ بھٹیوں کی تپش سے آس پاس کی دھرتی ماں کی پیٹ کی تہہ گرم رہتی تھی۔

— تم تو بالکل کہانی کار کی طرح ساری باتیں بیان کر رہے ہو!

— تو اور کیا کریں جناب! یادوں کے نام پر کہانیاں ہی تو بچی ہیں ہمارے پاس۔۔۔ بتاؤ بتاؤ۔۔۔ آگے بتاؤ! منٹو نے اس پچپن سالہ شخص کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا— میری عینک کے شیشوں پر بھی یادوں کے بہت سے داغ ہیں۔۔۔ یادوں کے سارے گودام بھر گئے تو یہ زحمت شیشوں کو اٹھانی پڑی۔۔۔ اپنی بات کہہ کر منٹو نے اس کی طرف دیکھا اور بولے— داستان جاری رکھو۔۔۔

پچپن سالہ شخص نے گہری سانس لے کر اندر کچھ زندہ کیا اور بولنے لگا

— یہ سب تفصیل سے اس لیے ذہن میں اٹکا ہوا ہے، کیونکہ جیت آپا کے گھر والوں کا ایک بھٹہ ہمارے ابا کے حصے میں آیا تھا۔ باقی تین بھٹوں پر اوروں نے قبضہ کرلیا تھا۔ لیکن یہ تو بعد کی بات ہے۔۔۔ جیت آپا ہی نے بتایا تھا۔

ہم نے پچپن سالہ شخص کی طرف دیکھا۔ وہ بولا—

— ان کے پڑوسی تھے باز خاں، جو الگ الگ منڈیوں سے پیاز خرید کر ایران کے ساتھ تجارت کرتے تھے۔ ان کے شادی شدہ بیٹے ریاض خاں بیوی کے ساتھ کھلی چھت پر رات گزارتے تھے، اس لیے اولاد کی آمد میں دیر ہو رہی تھی۔۔۔ اور ایک بار تو ایسی طوفانی آندھی آئی تھی، جو ان کی بیوی کی سوزنی ہی اڑا لے گئی تھی۔ وہ آندھی اڑی سوزنی صبح کسی اور کی چھت پر ملی تو میاں بیوی میں زبردست جھگڑا ہوا۔ بات طلاق تک پہنچ گئی۔ لیکن بعد میں یہ صاف ہوگیا تھا کہ ریاض کی بیوی کی سوزنی آندھی اڑا لائی تھی۔ تب بات ٹھیک ہوئی اور تبھی سے جیت آپا ریاض خاں کی [illegible] کو سوزنی بھابی کہہ کر پکارتی اور چڑھاتی تھیں۔۔۔

منٹو کو ہنسی آگئی اور آنکھوں میں چمک۔۔۔ انھوں نے پوچھ [illegible] پھر سوزنی بھابی چھت سے [illegible] اتری؟

— آپ تو مذاق کرتے [illegible] ہمیں کیا معلوم [illegible] نے منٹو کو دیکھتے ہوئے کہا— جیت آپا نے ہمیں [illegible] بتایا تھا۔

— تو پھر اس کے بعد۔۔۔

— جیت آپا کے چاچی نے آندھی والی رات کے بعد باز خاں کو پیش کش کی کہ بیٹے اور بہو کے لیے وہ ایک کمرہ چھت پر ڈال لیں۔ اینٹیں بھٹے سے آجائیں گی۔۔۔ گھر کی بات ہے پیسے ویسے کا سوال نہیں اٹھتا۔ دوسرے دن ہی باز خاں کے گھر کے سامنے اول نمبر کی اینٹوں کا چٹھا لگ گیا اور شاید اسی دن یہ اعلان ہوا کہ ملک آزاد ہونے والا ہے۔۔۔ پاکستان بننے والا ہے!

— ارے، وہ تو ہوا ہی، دنیا نے دیکھا۔ آزادی کیسے آئی۔۔۔ ہم نے بھی دو عالمی جنگوں کے بعد آزادی کو آتے دیکھا۔۔۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہوتے ہوئے منٹو نے کہا— ارے بھئی، وہ کافی کا کیا ہوا۔۔۔ ویسے کافی سے کام چلے گا نہیں، یہ وقت تو تلخ شربت پینے کا ہے!

— تو چلیے۔۔۔ وہی صحیح۔۔۔ سامنے تاج پیلس موجود ہے! میں نے کہا اور ہم تینوں ہوٹل کے سائبان سے ہوتے ہوئے لابی میں داخل ہوگئے۔ منٹو کچھ تھکے ہوئے تھے، بولے—

— تم بار کا پتہ کرو، تب تک میں آرام کر رہا ہوں!

میں بار کا راستہ معلوم کرنے کے لیے مڑنے ہی والا تھا کہ منٹو نے سوال کیا— وہ پچپن سالہ شخص کہاں گیا؟

ہم دونوں نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں، لیکن وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پتہ نہیں وہ کہاں چلا گیا تھا۔

— چھوڑو۔۔۔ ساتھ رہتا تو ہم اسے بھی تلخ شربت کی جھیل میں نہلا دیتے۔۔۔ آج اسے بھی عیش کرادیتے۔

تبھی لفٹ سے نکلتی، ساتھ والے آدمی کا ہاتھ چھڑاتی ایک بے حد خوبصورت عورت چیخی تھی— چھوڑو۔۔۔ تم کیا مجھے عیش کراؤ گے؟

ظاہر ہے ہم دونوں تیزی سے اس جانب متوجہ ہوئے۔ وہ مہذب لگتا شخص بڑی عزت اور سلیقے سے اس بے حد خوبصورت عورت کو روک رہا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ عالیشان ہوٹل میں کوئی سین کریٹ نہ ہونے پائے۔۔۔ لیکن وہ عورت اپنی رو میں اسے نظرانداز کرتی تیزی سے لابی کی طرف آئی تھی، بپھرتی ہوئی۔

Promotion of Urdu ... Council ... National ★ New Delhi
ACC 5180/FB
15/1/08

— ہوگا انڈسٹریلسٹ اپنے گھر کا۔۔۔ ایسے انڈسٹریلسٹ بہت پڑے ہیں دنیا میں۔۔۔ یہ خود کو آخر سمجھتا کیا ہے۔۔۔

— کیا بات ہے شوانی؟ ہوٹل کی وردی میں ملبوس ایک نہایت موڈرن عورت نے اسے آ کر روکا اور ٹوکا۔ وہ شاید ہوٹل کے فرنٹ ڈیسک کی انچارج تھی۔

— آخر ہوا کیا ہے؟

— یہ کپور پاگل ہوگیا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے یہ میرے ہسبنڈ کا واقف کار ہے۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس نے ہمیں سولن میں کوٹھی لے کر دی ہے۔۔۔ ارے ہم رفتہ رفتہ اس کی قیمت چکا دیں گے۔۔۔ جب اسے کروڑوں کے لون کی ضرورت تھی تو یہ منسٹری کا چکر کاٹتا تھا۔ بنگلے پر آ کر میرے ہسبنڈ کے تلوے چاٹتا تھا۔۔۔ آج مجھے جم میں ملا۔ لیڈیز آنجکلڈ۔۔۔ پھر پول پر ملا۔۔۔ میں خود پول پر ملنے چلی گئی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آئی ہیڈ کنسنٹڈ فار اینی تھنگ۔۔۔ مائی ہسبنڈ ڈزنٹ مائنڈ ویز ٹرائفل تھنکنگس، بٹ اسٹل۔۔۔

تبھی ایک اور شور اٹھا۔ ان دونوں کی باتیں شور میں ڈوب گئیں۔۔۔ آزادی کی پچاسویں سالگرہ پر نعرے لگ رہے تھے۔ اور وہاں ''آرٹ انڈیا۔50'' کا افتتاح کرنے کوئی منسٹر صاحب چلے آ رہے تھے۔ عجیب سی گہما گہمی تھی۔ پورے مینجمنٹ نے منسٹر صاحب کا استقبال کیا۔ بھیڑ اندر آ گئی۔ ''آرٹ انڈیا۔50 کا افتتاح کرنے وہ بھیڑ اور اسپیشل گارڈس کے ساتھ بیسمنٹ میں اتر گئے۔ وہ زیڈ کیٹگری والی حفاظت میں نہیں تھے۔

ہم جا کر فرنٹ ڈیسک والی انچارج لڑکی کے سامنے بیٹھ گئے۔

— کیا ہوا تھا آپ کی دوست شوانی کو؟

— کچھ خاص نہیں۔۔۔ ڈیسک انچارج لڑکی نے کہا — ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔۔۔

— پھر بھی، کچھ تو ہوا ہی تھا مس لونی اوبرائے! منٹو نے اس کی پتلی سی نیم پلیٹ پڑھ لی تھی۔

— ہونا کیا تھا۔۔۔ شوانی کمس فرام فینسی فیملی۔۔۔ اس کا ہسبنڈ گورنمنٹ آف انڈیا میں اڈیشنل فائنس سکریٹری ہے۔ اسے پیسے لی کیا کمی۔۔۔ اینڈ یو ہیو سین۔ شوانی کین لانچ اے تھاؤزنڈ شپس۔۔۔

— وہ تو ہے! میں نے منٹو کی طرف دیکھ کر کہا۔ منٹو نے سر ہلایا۔

— لیکن وہ اسٹوپڈ مین کپور۔۔۔ ہی ہیز اے کرش آن شوانی۔۔۔ فرام ایجز۔ وہ چاہتا ہے شوانی مسٹر سرین سے ڈائیورس لے لے۔۔۔

— کپور ان میریڈ ہے کیا؟

— اس عمر میں ان میریڈ کون ہوتا ہے! لونی اوبرائے بولی — ہی از ویری مچ اے میریڈ مین۔۔۔ چلو یہ بھی چلتا ہے۔۔۔ پر پتہ نہیں کس جھونک میں اس نے سوئٹزرلینڈ میں ایکس ایکڑ کی اسٹیٹ اور تین تھاؤزینڈ ملین پرسنل اکاؤنٹ کی بات اٹھا دی۔۔۔ اسٹوپڈ گیک۔۔۔ شوانی از ریل کلاس۔۔۔ اینڈ وہاٹ اے آنسر۔

ہم دونوں نے تیزی سے لونی اوبرائے کو دیکھا۔

— وہاٹ واز ہر آنسر؟

لونی اوبرائے کھلکھلا کر ہنس پڑی — شوانی کچھ بھی ہو لیکن شوانی شوانی ہے۔۔۔ اس نے کہا — رنجیت کپور! تمھارے پاس جتنی دولت ہے، لے آؤ۔۔۔ اسے میری آنکھوں کے سامنے جلاتے جاؤ۔۔۔ جتنی دیر وہ جلے گی، میں تمھاری رہوں گی!۔۔۔ وہاٹ این آنسر! بریوو شوانی! بریوو! جیسے لونی اوبرائے شوانی کو شاباشی دے رہی تھی — دس اونلی اے شوانی کین سے!۔۔۔ اونلی شوانی!

تبھی منسٹر صاحب کے لوٹنے کا شور برپا ہو گیا تھا۔۔۔ ایکس کیوز می کہتے ہوئے لونی اوبرائے اٹھ کر تیزی سے اُدھر چلی آئی تھی۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا منہ دیکھتے بیٹھے رہ گئے تھے۔۔۔

— ہم کس دور میں ہیں دوست! منٹو نے اداسی سے پوچھا تھا۔

— آزادی کی نصف صدی کے جشن کے دور میں منٹو بھائی!

منٹو نے میری بات اَن سنی کر دی اور سالگرہ کے سلسلے میں ہوٹل کی چمکتی دیوار پر گاندھی جی کی ڈانڈی مارچ کا جو موٹف بنا تھا، اسے دیکھنے میں مشغول ہو گئے۔ منٹو اس موٹف کو بڑی بڑی آنکھوں سے مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

— اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں منٹو بھائی؟

— یہی کہ گاندھی جی نے نمک قانون توڑ کر ہمیں نمک حلالی سکھا دی! بغیر کسی بارودی جنگ کے گاندھی نے انگریزوں کے گھٹنے توڑ دیے تھے۔۔۔

میں نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ اپنی رو میں بول رہے تھے۔

— دوست! انگریزوں نے پارٹیشن کا چولہا تو جلا دیا تھا، لیکن ہانڈی تو سرحدی گاندھی کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے تقسیم کے خلاف رائے شماری میں شامل ہونے سے انکار کر کے وہ ہانڈی خود جناح کے ہاتھوں میں تھما دی۔ کسان اور عوام کو تو پتہ بھی نہیں تھا۔ وہ ادھ پکی کھچڑی نہرو اور جناح نے آپس میں بانٹ لی۔۔۔ اور اس کھچڑی کا جشن ہم آج بھی منا رہے ہیں۔۔۔ چھوڑو یار۔۔۔ بار کدھر ہے، وہاں چلتے ہیں۔۔۔

ہم بار کی طرف بڑھنے لگے تو منٹو صاحب نے بتایا —

— دوست! ایک بات معلوم ہے تمھیں؟

— کیا؟

— میرے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ میرا جگر چھلنی ہو چکا ہے۔ شراب نوشی

سب کردوں۔ تو میں نے اس نیک ڈاکٹر کے سامنے اپنا ایک راز پیش کیا تھا! میں نے اسے بتایا تھا کہ میں جب اللہ میاں کی کائنات سے چلا تھا تو ایک دل اور ایک جگر اسپیر لایا تھا۔ دل تو صفیہ کے علاوہ کہیں لگا نہیں، اس لیے بچ گیا، لیکن جگر اب ساتھ نہیں دے رہا ہے، اس لیے اسے بدل دیجیے۔۔۔ میں نے اسے اسپیر جگر دیا، لیکن وہ نہیں بدل سکا۔۔۔ جاہل ڈاکٹر تھا۔۔۔ تو پھر ہوا یہی کہ 1955 کی 18 جنوری کو میں فوت کر گیا۔۔۔ معلوم نہیں تھا کہ موت کے بعد بھی زندگی ہوتی ہے۔۔۔ اسی زندگی کے تحت میں زندہ ہوں۔۔۔

ابھی ہم بار تک نہیں پہنچے تھے کہ درمیان میں پھر ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ ہند آزادی کی پچاسویں سالگرہ کا موقع۔ تیاریاں تو کئی ماہ پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں، اور اب ایم ٹی وی کو بے جانے والی ویزس لڑکیاں اور لڑکے، ستار پلیز سے نہیں، کرکٹ سیٹ تھا سے ہوٹل کی لابی پر حملہ سا کرتے چلے آرہے تھے۔

یہ عجیب نظارہ تھا۔

ہم دونوں سمجھ ہی نہیں پائے کہ اس دنیا میں جو پچاس برسوں میں بالکل بدل گئی ہے۔۔۔ یہ ہو کیا رہا ہے؟

پتہ چلا کہ پچاس سال پہلے آزاد ہوئے پاکستان کی کرکٹ ٹیم انڈیپنڈنس کپ میچ کھیلنے بھارت آئی ہوئی ہے اور اس کے سارے کھلاڑی اسی تاج پیلس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں!

اور اس سے پہلے کہ ہم ریسپشن پر جاکر پتہ کرتے، تب تک پاکستانی ٹیم کے منیجر نسیم، کپتان رمیز راجہ، اعجاز اور دھاکڑ بلے باز انضمام الحق چاروں بار کی طرف بڑھتے نظر آئے۔

میری بھی ان سے ملنے کی خواہش تھی۔ میں بھی منٹو کے ساتھ ادھر چل دیا۔ ملاقات ہوئی تو بہت اچھا لگا اور معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے اپنے پرانے گھروں اور اس وطن کو دیکھنا چاہتے ہیں جو ان کے بزرگوں کا وطن ہے۔

تیکیس سالہ انضی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ہلکی پرت اتر آئی۔ اس نے بتایا۔ ہم اپنے پرانے گھروں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اجازت کی ضرورت ہے۔ ایک ہندوستانی افسر آنے والا ہے۔۔۔ یہیں کافی بار میں، وہ شاید اجازت لے کر آرہا ہے۔ ہم اسی کے انتظار میں ہیں۔ میرا گھر گاؤں تو یہیں پاس میں ہے۔ ہانسی! حصار کے پاس۔۔۔

—اسی راستے تو بابر آیا تھا اور اسی راستے ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران کی طرف بھاگا تھا۔

—وہ سلطنت جیتنے آیا ہوگا، ہم تو میچ جیتنے آئے ہیں! یہ شاید ٹیم منیجر نسیم نے کہا تھا۔

— میں یہاں سے پرانے گھر محلے کی تصویریں اتار کر لے جاؤں گا۔۔۔ میں نے اپنے ابا جان سے وعدہ کیا ہے۔ ہانسی میں ہماری حویلی تھی، ایک مزار کے پاس۔ اب پتہ نہیں ہمارے دادا جان پیرزادہ ضیاء الحق کی کسی کو یاد بھی ہوگی یا نہیں۔۔۔ وہاں کچھ مسلمان تو شاید اب بھی ہوں گے!

تو منٹو سے رہا نہیں گیا، وہ بول پڑے—

— میاں انضمام الحق! یادیں ہندو یا مسلمان نہیں ہوتیں۔۔۔

انضی نے فوراً بات سنبھالی— میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔

— میں جانتا ہوں۔۔۔ جانتا ہوں برخوردار۔۔۔ اور کن یادوں کے ساتھ آپ کو بھیجا ہے آپ کے والد صاحب نے!

—جی، انھوں نے بتایا تھا، ہمارے محلے کو لوگ پیرزادگان کہتے تھے۔ کچھ لوگ اسے محلہ مغل پورہ بھی پکارتے تھے۔۔۔ کیا پتہ اس محلے کا نام بھی اب بدل گیا ہو!

— نہیں، نہیں، نام وام نہیں بدلے ہوں گے۔ میرے رشتے داروں کے شہروں، محلوں کے نام بھی نہیں بدلے ہیں۔۔۔ ان کے خطوط میں وہی نام آتے ہیں اور انھیں پتوں پر ہم انھیں خط لکھتے ہیں! رمیز راجہ نے کہا— ہمارے سسرال والوں کے نزدیکی رشتے دار اب بھی کرنال میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا مل کر آنا۔۔۔

انضی بڑے دھیان اور امید سے اپنے کپتان رمیز راجہ کو دیکھ رہا تھا۔

— میرے اپنے خاندان کے لوگ جے پور میں ہیں! رمیز راجہ ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بتانے لگا— اب دیکھیے نا، میں لاہور کا ہوں، میری ساس دہلی کی، میرے خسر صاحب کرنال کے۔۔۔ لاہور، لاہور ہے لیکن دہلی کی تہذیب میں نے اپنی بیوی سے سیکھی ہے۔۔۔ جو اس کی رگوں میں اپنی ماں کے خون کی وجہ سے چل رہی ہے۔

دو ایک پل ٹھہر سے گئے۔۔۔

اعجاز نے وہ ٹھہراؤ توڑا— جانا تو میں بھی جالندھر چاہتا ہوں، اپنے نزدیکی رشتے داروں سے ملنے۔۔۔ لیکن وقت اور اجازت کہاں ہے؟

تبھی وہ ہندوستانی افسر سرین، ان لوگوں کو پہچانتا، ہاتھ بڑھائے، لپکتا ہوا آیا اور ہاتھ ملا کر اس نے خوشخبری دی— آپ لوگوں کو اجازت مل گئی ہے!

—ہرّے! کی آواز سے کافی بار گونج گیا۔

وہاں موجود لوگ مسکرانے لگے، انھیں ہرّے کی وجہ تو معلوم نہیں تھی لیکن ان کی مسکراہٹوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سب کسی اچھی خبر کے احساس سے مسکرا رہے تھے۔۔۔

—ارے نسیم بھائی کہاں ہیں؟ انضی نے کہتے ہوئے انھیں ڈھونڈا تو

دیکھا کہ ہوٹل کا بیل کیپٹن انھیں ایک فیکس پیغام تھما کر واپس جا رہا ہے۔۔۔

انھیں دیکھتے ہی تینوں قریب قریب چیخ پڑے—

— نسیم بھائی! بھارت سرکار نے اجازت دے دی ہے!

منیجر نسیم کچھ مایوس سے وہ کاغذ لیے پاس آئے تو انھی نے بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے پوچھا— نسیم بھائی! اب تو میں ہانسی جا سکتا ہوں!

— شاید نہیں!

— کیوں؟

— میں نے کرکٹ کنٹرول بورڈ سے آپ لوگوں کے لیے اجازت کی سفارش کی تھی، لیکن ابھی کراچی سے اپنے کرکٹ کنٹرول بورڈ کا یہ فیکس پیغام آیا ہے۔ بورڈ نے اجازت دینے سے انکار کردیا ہے! کہتے ہوئے منیجر نسیم نے فیکس والا کاغذ ان کی طرف بڑھا دیا۔۔۔

— اوہ شِٹ! کہتے ہوئے انھوں نے کاغذ وہیں میز پر پھینک دیا۔

— پاکستان زندہ باد! منو نے گونجتا ہوا نعرہ لگایا، کچھ ایسے جیسے وہ نشے میں ہوں۔ لوگ ایک بار پھر بری طرح چونکے۔ اس بار ان کے چہروں پر حیرانی اور ماتم تا۔

— تم لوگ تو نامی گرامی بھی ہو۔۔۔ یہاں اور وہاں لاکھوں معمولی لوگ اسی تکلیف سے تڑپ رہے ہیں! کہتے ہوئے منو کی آنکھیں عینک کے شیشوں سے باہر آ رہی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے بولے— چلو دوست! بار میں چلو، ہم اپنی شام کیوں خراب کریں! چلو!

ہم بار کی طرف چل دیے۔

تعجب کہ سامنے سے ہمارا پچپن سالہ ہمسفر شخص ہماری ہی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس نے دور سے ہمیں دیکھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عورت بھی تھی۔

منو نے چلتے چلتے غور سے ان دونوں کو دیکھا پھر مجھے۔ منو نے ایک بار پھر پچپن سالہ شخص اور اس کے ساتھ والی عورت کو تعجب سے دیکھا۔

— بڑا چالو لگتا ہے۔ یہ پچپن سالہ شخص کس عورت کو پکڑ لایا؟ منو نے کہا۔

— نہ معلوم کون ہے؟

— لباس تو وردی جیسا لگ رہا ہے۔

— اسی ہوٹل میں کام کرتی ہوگی۔۔۔

— تب تو یہ ہم سے بازی مار لے گیا!

— ابھی پتہ چل جائے گا، کون ہے یہ عورت۔۔۔ میں نے منو کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

تب تک وہ دونوں ہم تک پہنچ چکے تھے۔

پچپن سالہ شخص نے بڑے حوصلے سے اعلان کیا—

— یہی ہیں ہماری جیت آپا!

— وہ۔۔۔ وہ ڈھیری راولپنڈی والی!

— ست سری اکال۔۔۔ جیت نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

— اتفاق دیکھیے۔۔۔ یہ یہاں مل گئیں۔۔۔ اتنے برسوں بعد! پچپن سالہ شخص نے حوصلے سے کہا۔

— آپ یہیں کام کرتی ہیں؟

— ہاں جی!

— کیا کام کرتی ہو؟

— جتنا برا اس کا سامان ہے۔۔۔ کنڈے، گملے، پینٹس۔۔۔ انھیں چمکاتی ہوں!

— کب سے ہو آپ یہاں؟

— سات آٹھ مہینے ہوئے!

— اس سے پہلے؟

— اس سے پہلے میں دہلی پولیس کی وردیاں سلتی تھی۔

— کتنے برسوں بعد ملے ہو آپ دونوں؟

— چوراسی کے بعد۔۔۔

میں اس سے ادھر ادھر کے سوال پوچھ ہی رہا تھا کہ دیکھا منو بار بار اپنی عینک صاف کر رہے تھے، صاف کرتے تھے، لگاتے تھے اور اس پچپن سالہ شخص کو دیکھتے تھے۔ پھر عینک اتارتے صاف کرتے اور اُس عورت کو دیکھتے۔

چوتھی بار دیکھنے کے بعد وہ پاس کھسک کر عورت سے بولے—

— تمھارے ماتھے پر زخم کا یہ گہرا نشان؟

— جی، یہ 1947 میں لگا تھا!

— اسی نشان کے بارے میں میں نے آپ کو بتایا تھا! پچپن سالہ شخص بیچ میں بولا۔

اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے، حیرت سے۔ اُس پچپن سالہ شخص اور اُس عورت جیت کو۔ دونوں کے ماتھوں پر قریب قریب ایک سے گہرے نشان تھے۔ اسی بات کی اس نے ابھی تائید کی تھی اور پہلے بھی بتایا تھا۔

اب یہ تھوڑی عجیب سی بات لگ رہی تھی، پر بات تو سامنے تھی اور یہی تھی۔

پچپن سالہ شخص کے ماتھے پر 1984 کا زخم اور جیت کے ماتھے پر 1947 کا زخم! بات الجھ رہی تھی تو میں نے پچپن سالہ شخص سے پوچھ ہی لیا—

— تم یہاں 1984 میں کیسے پہنچ گئے؟

— جی، وہ ایسا تھا۔۔۔

منو اُسے غور سے دیکھ رہے تھے — ہاں، بولو۔۔۔ بولو۔۔۔

— جی وہ ایسا تھا کہ ڈھیری راولپنڈی میں ہمارے ابا کو انھیں کے گھر کا قبضہ ملا تھا۔ ہمارے ابا مکان کے دروازے پر لکھ آئے تھے — پاکستان زندہ باد!

الحمد للہ یہ مکان سید انوار حسین مہاجر کرنالوی کے نام الاٹ ہو گیا ہے! اس کے تیسرے دن ہم اس گھر میں داخل ہو گئے تھے۔۔۔ مجھے یاد ہے سب سے پہلے ابا اور امی نے گھر بھر میں پہلے خون کے دھبوں کو دھویا تھا۔

— امی بار بار شکایت کر رہی تھیں — یہ کہاں اٹھا لائے بچوں کو۔۔۔ یہ گھر ہے کہ بوچڑ خانہ۔۔۔

جیت آنکھوں پر پلو لگائے دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔

منو کی آنکھوں میں دھواں بھرا تھا۔ انھوں نے چشمہ پھر صاف کیا— ایک گہری سانس لی۔ پھر دھیرے سے بولے—

— تمھارے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا؟

جیت نے آنکھیں سکھائیں۔۔۔

— کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔۔۔ دل دہلتا ہے۔۔۔ رُلائی روک کر جیت نے بتایا— ہمارے گھر وہیں تھے ڈھیری میں۔۔۔ اینٹوں کے بھٹے تھے ہمارے۔ ہمارا پورا کنبہ وہیں رہتا تھا۔ بغل میں باز چچا کا گھر تھا۔۔۔

— انھیں کی بہو تھی تمھاری سوزنی بھابی!

سن کر جیت کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی—

— لگتا ہے آپ لوگوں کو سب کچھ بتا دیا ہے اس تپن نے!

— تپن!

— جی میرا نام ہے! پچپن سالہ شخص نے کہا۔

— یہی رہتے ہیں اب ہمارے چھوڑے ہوئے گھروں میں۔۔۔ جیت نے کہا۔

— تم لوگ گھر خود چھوڑ آئے تھے؟

— اپنا گھر کون چھوڑتا ہے۔۔۔ چھوڑنا پڑا تھا۔۔۔ ہم لوگ امن چین سے رہ رہے تھے، خوش حال تھے۔ تبھی آزادی آئی۔ سارا ماحول ہی بدل گیا۔ وہ آس پاس کے گاؤں سے آئے تھے۔ ایک دن بیس بائیس لوگوں کا جتھا آیا۔ ہم لوگوں کے دلوں میں دہشت سا گیا۔ اس وقت باز چچا اور پڑوس کے لوگوں نے انھیں سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ پھر ہمارے کنبے کے سارے افراد رات کو ہی گھر میں جمع ہوئے۔ کل اکیس لوگ تھے ہم۔۔۔ یہی طے ہوا کہ ہم ڈھیری چھوڑ دیں گے۔۔۔

بولتے، بتاتے جیت کی آواز ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی، سپاٹ ہوتی جا رہی تھی۔ اس میں نہ دکھ تھا نہ درد۔

— لیکن چھوڑنے کے لیے انتظام ہونا تھا۔ اس میں تین چار دن لگنے ہی تھے۔ لیکن خطرہ بہت بڑھ گیا تھا، اس لیے باز چچا نے اپنی حویلی میں آنے اور رہنے کی بات کہی۔ ہم لوگ ان کی حویلی میں چلے گئے۔ کنک کی بوریاں رکھ کر انھوں نے ہمارے لیے حفاظت کی دیوار بنا دی۔ رات گزر گئی۔ صبح ہم اپنے گھر میں آ گئے۔ رات باز چچا کے گھر میں گزارنا ہی ٹھیک سمجھا گیا تھا لیکن پھر دوسری رات نہیں آئی۔ دن دوپہر میں ہی پاس پڑوس کے پلد رو گاؤں سے پانچ سو لوگوں کے جتھے آ گئے۔ انھوں نے ہمارے گھروں کو گھیر لیا۔ چیخ، پکار، نعرے لگنے لگے۔ ان حملہ آور جتھوں میں سے کسی نے اعلان کیا—

— باہر نکل آؤ کافر! حلال میٹ کھاؤ اور اسلام قبول کرو تو ہم تمھیں بخش دیں گے!

— میرے پتا جی نے یہ قبول نہیں کیا۔ انھوں نے اندر سے ہی جواب دیا— نہیں! ہمیں موت قبول ہے۔ تبھی اوپر چھت ٹوٹنے لگی اور آنگن میں گولیوں کی بوچھار ہوئی۔ بے بے نے پتا جی کے پاؤں پکڑ لیے — منظور کرلو! تو تایا جی نے یہ کہتے ہوئے کہ یہ کہنا حرام ہے، ان کی گردن کرپان سے کاٹ دی۔ تین مہینے کا میرا چھوٹا بھائی بے بے کی گود میں تھا۔ وہ خون سے تر بتر ہو گیا۔ تب تک پتا جی نے ہم سبھی کو کرپانیں تھما دی تھیں۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ حملہ آور اوپر سے یا دروازہ توڑ کر اندر آ جائیں تو ہم بائیں طرف کرپان مار لیں۔ اتنا کہہ انھوں نے بے بے کی خون بھری اوڑھنی تلوار پر اٹھائی اور اور خود ہی نیم پاگل کی طرح تیزی سے باہر نکل گئے۔ چاروں طرف سے ان پر چاقوؤں، تلواروں اور برچھوں کے وار ہوئے۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ان کا یہ حال دیکھ کر تایا جی بھی کرپان لے کر باہر بھاگے۔ ان کا بھی وہی حال ہوا۔ ڈاکٹر ویر جی نکلنے لگے تو بھابی نے انھیں روکا— پہلے ہمیں مار دو، تب باہر جاؤ۔ انھوں نے بھابی کو مارا، اپنے چار سال کے بیٹے کو مارا، بہنوں کو مارا۔ میں ڈری ہوئی اندر تھی۔ ویر جی باہر نکل گئے۔۔۔ ان کا بھی وہی حال ہوا۔ تبھی کوٹھری سے چاچی جی میری بانہہ تھامے نکلیں۔ بولیں — کیسی لڑائی لڑنے آئے ہو! مجھے اپنے بچوں کو ایک بار دیکھنا ہے! تبھی ان پر اینٹوں کی بوچھار ہوئی۔۔۔ وہیں چتھا لگا تھا۔ کچھ دیر انھوں نے چوٹیں کھائیں، پھر گر پڑیں۔ ان لوگوں نے ان کے گلے کی مالا، ہاتھوں کی چوڑیاں اور کان کی بالیاں کھینچ لیں۔ وہ وہیں مر گئیں۔ اسی وقت میرے ماتھے پر وار ہوا۔ پھر کیا ہوا ٹھیک سے معلوم نہیں۔ لیکن باز چچا بھی مار ڈالے گئے۔ ہمارے ایک چچا بچے تھے، وہ راولپنڈی سے ہمیں ہی لینے آ رہے تھے۔ انھوں نے پورے کنبے کو بھٹوں کی آگ میں جلایا اور مجھے لے کر جانے کیسے دہلی پہنچ گئے۔۔۔ پھر یہیں دہلی میں رہی۔ پھر شادی ہو گئی۔۔۔ پھر۔۔۔

کہتے ہوئے وہ چپ ہو گئی۔۔۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔۔۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ جیت کی آنکھوں میں ریت اڑ رہی تھی۔

میں نے بہت آہستہ سے خاموشی توڑی— پھر؟

جیت نے اپنی آنکھیں اوڑھنی سے ڈھانپ لیں۔ وہ شاید اب کچھ بولنا

نہیں چاہتی تھی۔ منو نے اس پچپن سالہ شخص کی طرف دیکھا۔

— میں وہیں ڈھیری میں بھٹے پر بڑا ہوا۔ جب حالات کچھ بدلے تو دھیرے دھیرے خبریں ملنی شروع ہوئیں۔ کون کہاں ہے؟ کون نہیں ہے۔ کون مرکھپ گیا۔ کئی سال بعد ایسے ہی خبر ملی کہ ڈھیری کے بھٹے والے سردار جی کی ایک لڑکی دہلی میں ہے۔ کچھ اتہ پتہ بھی ملا۔ جب گھر صاف کیا گیا تھا تو کسی موکھے میں ایک گٹکا گرنتھ صاحب اور کچھ بھٹے کے کاغذات ملے تھے۔۔۔

— بھٹے کے کاغذات؟ منو نے پوچھا۔

— جنم پتریاں۔۔۔ میں نے وضاحت کی۔

منو کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا— مرنے والوں کی جنم پتریاں!

— جی ہاں! پچپن سالہ شخص بولا— امی نے بھی کہا تھا، انھیں سنبھال کے رکھ دے، تیرے ابو کو کبھی کرنال جانے کا موقع ملا تو اسی بہانے ڈھیری والوں سے بھی مل آئیں گے۔۔۔

— ڈھیری والوں سے۔۔۔ میں نے امی سے پوچھا تھا— ڈھیری والے تو اب ہم ہیں۔ تو امی نے بڑی آسانی سے سمجھا دیا تھا— نہیں بیٹا۔۔۔ وہ بھٹے والے دوسرے ملک چلے گئے ہیں۔۔۔ وطن تو ان کا یہی ہے۔۔۔ جیسے تیرا کرنال۔۔۔ میں کچھ سمجھ پایا تھا، کچھ نہیں، لیکن سوچ کر اچھا ضرور لگا تھا کہ ہمارا ایک وطن بھی ہے۔

منو نے اسے غور سے دیکھا تھا۔

— تو ابا نہیں آپائے۔ انھیں اجازت نہیں ملی۔ سینتیس سال بعد مجھے اجازت ملی۔ تب میں بیالیس کا تھا۔ تب تک بھٹا ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ نئے مالک لاہور کے تھے۔ انھوں نے مہربانی کرکے مجھے تھوئی کا کام دے دیا تھا۔ میں مالکانہ حق چھوڑ کر اب اینٹیں تھاپنے لگا تھا۔ سانچے میں مٹی بھر کر میں نئے مالک کا نام بھی اینٹوں پر تھاپتا تھا۔

اس بار پچپن سالہ شخص کو دیکھ کر جیت نے دھیرے سے کہا— ہم بھی بھٹے والے کہاں رہ گئے۔ دار جی رکشہ چلاتے تھے تو میں رکشے والی ہوگئی۔۔۔ پھر درزن اور اب ان کے بعد صفائی کرنے والی۔۔۔ یہ جن انھیں دنوں ہمارے پاس گٹکا اور جنم پتریاں لے کر آیا تھا، جن دنوں فسادات بھڑکے تھے۔

— ہاں۔۔۔ انھیں لے کر میں اسی لیے آیا تھا تاکہ انھیں یقین ہو جائے کہ میں انھیں کے گھر سے آیا ہوں۔۔۔ ایک دن پہلے ہی اندرا گاندھی کو مار ڈالا گیا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ ان کی گلی پر جب حملہ ہوا تو میں انھیں کے گھر بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

— پولیس بھی اس دن ہمارے خلاف ہوگئی تھی۔ وہی پولیس جس کی میں وردیاں سلتی تھی۔ ایک پولیس والے نے ہی ہمارے دونوں بیٹوں اور دار جی کو گولیوں سے بھون دیا تھا۔ کہہ کر وہ آنکھیں دبا کر سسکنے لگی تھی۔

— وہیں کسی بلوائی نے مجھے مونا سمجھ کر وار کیا تھا۔۔۔ تبھی یہ چوٹ مجھے لگی تھی۔۔۔ میں جیسے تیسے جان بچا کر بھاگا تو ایک جگہ آگ میں گھر گیا تھا۔ جلتے ہوئے گھر کے باہر ایک بوڑھی سردارنی ہاتھوں میں کئی کڑے پہنے انھیں سے اپنی چھاتی پیٹتے ہوئے پاگلوں کی طرح بین کر رہی تھی— ہائے ربا! میرے تو آٹھوں چلے گئے۔۔۔ بھاگتے بھاگتے سننے کا موقع تو تھا نہیں۔۔۔ لیکن دور تک اس آواز نے میرا پیچھا کیا— ہائے ربا! بارہ تو ملتان میں دے آئی۔۔۔ آٹھ یہاں دے دیے۔۔۔

اس کی کلائی میں ان آٹھوں کے کڑے تھے جو قتل کر دیے گئے تھے۔ کڑوں کی وہ آواز مجھے آج بھی سنائی پڑتی ہے۔۔۔ دل میں درد سا اٹھتا ہے۔۔۔

— اس ماتھے والے زخم میں درد نہیں ہوتا؟ منو نے تبھی بے ساختہ پوچھا۔

پچپن سالہ شخص یکبارگی گھبرا گیا، جیسے وہ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے جیت کی طرف دیکھا۔۔۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

دونوں مجھے ایک پل کے لیے ہم شکل لگے۔ دونوں کے زخم چمک رہے تھے۔۔۔

تبھی منو چیخ پڑا— ہندوستان زندہ باد! پاکستان زندہ باد! آزادی مبارک!

تاج پیلس کی لابی بری طرح تھرا گئی۔۔۔

ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

پچپن سالہ شخص اور جیت کے رونے کی تیز آوازیں ہمیں سنائی پڑیں۔۔۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، وہ دونوں خاموش تھے۔ میں نے منو سے پوچھا— آپ نے سنیں۔۔۔ یہ رونے کی چیخیں کہاں سے آئی ہیں۔۔۔

— اس پار اور اس پار، دونوں سے! منو نے نیم پاگل فلسفی کی طرح کہا

— میرے دوست! صدیاں بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن درد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

تب تک مینجمنٹ کے سپاہی اور وردی والے چوکیدار ہم پر حاوی ہو چکے تھے اور ایک کڑکتی آواز آئی تھی— یہ کہاں سے گھس آئے! نکالو، ان پاگلوں کو باہر! اور ہمیں باہر کھدیڑ دیا گیا تھا۔ میں اس بدحواسی میں مدد کے لیے منو کو تلاش کر رہا تھا، لیکن وہ غائب تھے۔۔۔ وہ شاید پھر کہانیوں میں پناہ لے کر کتابوں میں بند ہوگئے تھے!!

□□□

شہاب ظفر اعظمی

# وہاب اشرفی سے گفتگو

**پروفیسر وہاب اشرفی معاصر اردو تنقید کا ایک اہم نام ہے۔ ان کی کتابوں میں تاریخ ادبیات عالم، قطب مشتری اور اس کا تنقیدی جائزہ، معنی کی تلاش، اردو فکشن اور تیسری آنکھ، مابعد جدیدیت مضمرات و ممکنات، شاد عظیم آبادی اور ان کی نثرنگاری اور معنی سے مصافحہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آپ رانچی یونیورسٹی میں پروفیسر کے علاوہ بہار انٹر میڈیٹ کونسل اور بہار کالج سروس کمیشن جیسے اہم اداروں کے چیئرمین بھی رہے۔ تنقیدی و علمی خدمات کے لیے انھیں کئی اہم اور گراں قدر انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔ آج کل پٹنہ سے اردو کا ایک معیاری ادبی رسالہ سہ ماہی "مباحثہ" نکال رہے ہیں۔ ان سے کی گئی گفتگو کے اقتباسات قارئینِ "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔**

**سوال: آپ تنقید کی طرف کیوں اور کیسے راغب ہوئے؟ آپ کی پہلی تنقیدی تحریر کون سی تھی؟**

جواب: میں ابتدا میں افسانے لکھتا تھا۔ اتنے افسانے ہوچکے تھے کہ ایک مجموعہ مرتب کیا جاتا لیکن ایک صاحب کو افسانوں کے سارے تراشے دے دیے اور وہ مشرقی پاکستان ہجرت کر گئے اور ساتھ میں وہ تراشے بھی لیتے گئے۔ بہت سے افسانے پاکستانی رسالوں میں چھپے تھے، انھیں اب دوبارہ ڈھونڈنا میرے لیے محال ہے۔ اس حادثے کے بہت گہرے اثرات پڑے، ایک عرصے تک افسانے نہیں لکھے، آخری افسانہ اس وقت لکھا جب جدیدیت کی تحریک جڑ پکڑ چکی تھی اور اشاعت کے لیے "شب خون" میں بھیج دیا۔ وہ شائع تو ہوا لیکن اس رسالے کے آخری صفحات میں، ایک اور صدمہ ہوا اور مجھے ایسا لگا کہ میں اب افسانے نہیں لکھ سکتا چنانچہ افسانہ نگاری ترک کردی۔ لیکن جہاں تک تنقید کا معاملہ ہے میں نے شاید بی اے کے زمانے میں ہی کلکتے میں تابان القادری پر ایک مضمون لکھا تھا۔ اس زمانے میں میرے دوست سلیمان ذوگلے صاحب تابان القادری پر ایک کتاب مرتب کررہے تھے۔ وہ تنقیدی مضمون ان کی کتاب "نقوش تاباں" میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کلکتہ کالج کے میگزین میں اسی زمانے میں بیخود دہلوی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ ابھی ابھی کلکتے سے بیخود نمبر شائع ہوا ہے میں نے دیکھا کہ اس میں میرا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ غرض مطلب یہ کہ میں تنقید طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھتا رہا ہوں۔

**سوال: کسی فن پارے کی تنقید کرتے ہوئے آپ متن پر زیادہ توجہ دیتے ہیں یا اظہار واسلوب بیان پر؟**

جواب: متن ہی میں اظہار و بیان بھی ہوتا ہے۔ متن الفاظ سے مرتب ہوتا ہے، الفاظ خیالات کو ایک جہت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے اگر متن پر نگاہ نہ ہو تو اظہار و بیان کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لہٰذا میں نے جہاں تنقید میں کوشش کی ہے کہ مفہوم و معنی واضح ہوجائیں وہاں فنکار کی اپنی خصوصیات جو اسلوب بیان سے سامنے آتی ہیں وہ بھی واضح ہوجائیں۔

**سوال: جمالیاتی نقاد فن کی جمالیاتی اقدار پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ کیا یہ مناسب ہے؟**

جواب: ۔ جمالیات یا جمالیاتی احساسات کو نظرانداز کردینا یا رد کردینا اچھی بات نہیں ہے۔ ہر ادیب اپنے طور پر احساس جمال رکھتا ہے پھر اس کے لکھنے کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ یہ دونوں ہی چیزیں جب ایک دوسرے کے ساتھ مل جاتی ہیں تو ادب پارہ مرتب ہوتا ہے۔ جمالیات پر بہت زیادہ زور دینے سے آپ کی مراد اگر ادب برائے ادب کا مسئلہ ہے تو اس پر تو تسلسل سے لکھا جاتا رہا ہے۔ میرے خیال میں چند ہی لوگ ملیں گے جو اب اس موقف کو تسلیم کرتے ہیں۔

**سوال: آپ کے خیال میں تنقید کی زبان کیسی ہونی چاہیے؟**

جواب: میں یہ سمجھتا ہوں کہ اصطلاحات سے بوجھل تحریر بہت سی الجھنیں پیدا کرتی ہے۔ نقاد کو ہمیشہ یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ وہ کسی ادب پارے کے بارے میں معنی و مفہوم کے علاوہ اظہار بیان اور دوسرے لوازم کی توضیح کررہا ہے لہٰذا زبان ایسی ہونی چاہیے جو پُر اثر اور واضح ہو۔

**سوال: آپ نے لکھا ہے کہ "میں ادب میں آفاقیت کا قائل ہوں" کیا آپ ادب کی مقامی قدروں کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے؟**

جواب: آفاقیت سے میری مراد وہ تمام امور ہیں جو بہت حد تک ناگزیر بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان سے چشم پوشی عدم آگہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر نئے اور تازہ بکار وہ خیالات جو عالمی (global) ہیں ان کی طرف ہماری توجہ نہیں ہے تو بہت سی چیزوں سے ہم محروم رہ کر سکتے ہیں۔ اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہم اپنے علاقائی مطالبات، تقاضے اور مقامی احوال وکوائف کو پس پشت ڈال دیں۔ ادب تو اپنی ہی مٹی کی خوشبو پیش کرتا ہے یہ اور بات ہے کہ اس کی خوشبو کو مزید تیز کرنے کے لیے کچھ چیزیں کہیں نہ کہیں سے اخذ کرنی پڑتی ہیں۔

**سوال: مابعد جدیدیت کے نام سے ادب میں جو رجحان شروع ہوا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟**

جواب: ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح لوگ ابتدا میں جدیدیت سے برسرپیکار تھے لیکن ترقی پسندی کی انتہا پسندی سے عاجز آکر آخرش اس کی طرف راغب ہوگئے لیکن جدیدیت بھی ایک منشور کے تحت تخلیق کو زنجیر میں جکڑنے کے درپے رہی جس میں منفی عناصر کا بڑا اہم رول رہا تو ایسے میں کسی نہ کسی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ مابعد جدیدیت ایسی ہی تبدیلی کا نام ہے جس میں منفی کی جگہ کتنے ہی مثبت پہلو مضمر ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب کوئی رجحان یا تحریک سامنے آتی ہے تو اس کی اشاعت یا تفہیم کا مسئلہ نقادوں کے ہی سر ہوتا ہے اس لیے کہ عام طور سے خالق اپنی تخلیقی کاوش میں کسی بھی تحریک سے متاثر ہونے میں کافی محتاط ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اب نقاد مابعد جدیدیت کی ابہام و تفہیم کے پہلوؤں کو سامنے لانے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں ہندوپاک سے کئی کتابیں اردو ہی کے حوالے سے شائع ہوچکی ہیں۔ میں نے بھی اپنے طور پر ایک کتاب قلمبند کی جس کا نام ہے ''مابعد جدیدیت، ممکنات و مضمرات'' — اس کتاب میں مابعد جدیدیت کی بہت سی شقوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے مطالعے سے تنقیدی صورت حال کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ قبل ازیں پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اس موضوع پر کئی کتابیں قلمبند کی ہیں اور سب کی سب تنقیدی زمرے کی ہی چیزیں ہیں۔

**سوال: "تاریخ ادبیات عالم" کی تدوین کا کیا مقصد ہے؟ کیا چند جلدوں میں دنیا کے جملہ ادب کی تاریخ پیش کی جاسکتی ہے؟**

جواب: میں نے پہلی جلد کے پیش لفظ میں اس کا احساس دلایا تھا کہ کسی ایک زبان یا ایک ادب کی تاریخ بھی چند جلدوں میں نہیں سما سکتی چہ جائیکہ عالمی ادبیات۔ لیکن کسی نہ کسی کو دنیا کے ادبیات کی ایک جھلک تو دکھانی ہی تھی یہ کام اگر میرے ذریعے ہوگیا تو میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ سکتا ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ سات جلدیں کیا اس کے لیے سات سو جلدیں بھی ناکافی ہوں گی۔ لیکن عالمی ادبیات سے محض اجمالاً متعارف کرانا ہی میرا مقصد تھا اور شاید میں اس مقصد میں کامیاب بھی ہوا ہوں۔

**سوال: کیا آپ موجودہ دور میں لکھے جارہے فکشن سے مطمئن ہیں؟**

جواب: دنیا کے ادب کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ شاعری کے علاوہ دوسری صنفیں ہمیشہ پیچھے پیچھے چلتی ہیں۔ شاید دنیا کی کوئی تاریخ ایسی نہ ہوگی جس میں شاعری کو دوئم درجہ دیا گیا ہو، چاہے کوئی دوسری صنف کتنی ہی ارتقا پذیر کیوں نہ ہوجائے۔ یعنی شاعری کی اہمیت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ مگر بیسویں صدی کے مسائل اس کا تقاضا کرتے تھے کہ فکشن کی طرف زیادہ توجہ دی جائے اور یہ کام عالمی پیمانے پر ہورہا ہے اس لیے اس کا سرمایہ قابل لحاظ ہوگیا ہے۔ اردو میں بھی یہی صورت ہے۔ دراصل آج کی پیچیدہ زندگی میں مسائل کی بھرمار ہے ان مسائل سے براہ راست فکشن نگار ہی ٹکراتا ہے۔ ایسے میں زندگی کے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ اس کی ریزہ چینی بھی فکشن کے احاطے میں آگئی ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ چند کمیوں کے باوجود اردو فکشن نگاری کی روش ایسی ہے جس پر اطمینان کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔

**سوال: تنقیدی سرگرمیوں سے متعلق آپ کا عام تاثر کیا ہے؟**

جواب: آج کی تنقیدی سرگرمیاں مختلف جہتوں میں تقسیم ہوگئی ہیں، ایک طرف ترقی پسندی نے پھر زور پکڑا ہے۔ نئی ترقی پسندی کے حوالے سے کچھ لوگ اس تحریک میں نئی جان ڈالنا چاہتے ہیں۔ مابعد جدیدیت یہ کہتی ہے کہ بہت سے وہ پہلو جو ترقی پسندی کی میراث تھے وہ مابعد جدیدیت کے رجحان کے مطابق تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ بہت سے مرکزی نکات اس میں در آئے ہیں۔ پھر جدیدیت کے بعض لوگ ہیں جو ہنوز کچھ امور پر زور دے رہے ہیں گویا آج کی تنقید کم ازکم سہ سمتی ضرور ہوگئی ہے لیکن غالب حصہ وہی ہے جسے میں نے مابعد جدیدیت کا نام دیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ 1980 کے بعد کے لکھنے والے اپنی ذہنی آزادی پر زور دے رہے ہیں اور یہ احساس دلاتے ہیں کہ ان کی تخلیق کسی بھی تحریک سے متاثر نہیں اور وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں آزادانہ طور پر لکھ رہے ہیں لیکن ایسی تحریروں میں بھی بعض تحریکوں کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

**سوال: آپ بڑی پابندی سے "مباحثہ" نکال رہے ہیں، کیا اس کی طویل عمر کی توقع کی جاسکتی ہے؟**

جواب: میں ''مباحثہ'' سے متعلق یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں کوشش کروں گا

کہ جو زندگی میری ہے اس کی بھی رہے۔ یہ میری خواہش ہے ویسے کیا ہوگا اللہ جانے۔

**سوال: اردو کی موجودہ صورت حال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟**

جواب: اردو کی موجودہ صورت حال پہلے سے مختلف نہیں ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب تک وہ رویہ جو آزادی کے وقت ہندوستان میں اردو کے ساتھ روا رکھا گیا تھا وہ لازماً ختم نہیں ہوا۔ یوں تو ادارے بہت سے ہیں لیکن اکثر معطل ہیں، کارکردگی ناقص ہے۔ ایسا بھی ہے کہ آہستہ آہستہ ہندی کا غلبہ بڑھ رہا ہے، اردو گھرانوں میں خود اردو والے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے تقریباً روک رہے ہیں۔ خصوصاً جن کا داخلہ انگریزی اسکولوں میں ہوجاتا ہے وہ زیادہ تر اپنے بچوں کو اردو سے الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مدرسے خصوصاً اسلامی مدرسوں میں چوں کہ ذریعۂ تعلیم لازماً اردو ہے اس لیے وہاں سے جو بچے جیسے بھی نکل رہے ہیں ان کا رشتہ اردو سے قائم ہے۔ ایک بات اور ہے کہ کتابیں فروخت ہورہی ہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ اردو کے پڑھنے والوں کا حلقہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ نئی کتابوں کی کھپت زیادہ ہوگئی ہے۔ اشاعت کی سہولتوں نے نئی کتابوں کی اشاعت کے سلسلے کو تیز کردیا ہے۔ مجموعی طور پر اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے خود اردو والوں کو زیادہ سنجیدہ ہونا پڑے گا۔ اگر ہر گھر جس میں بچے یا جوان ہیں میں ایک اردو رسالہ لازماً خریدا جائے تو صورت حال کچھ بدل سکتی ہے۔

**سوال: کیا اردو صرف مراعات پر زندہ رہ سکتی ہے؟ یا اس کو آئینی تحفظ کی ضرورت ہے؟**

جواب: مراعات بھی ملنی چاہیے اور آئینی تحفظ بھی اور خود اردو والوں کو بھی چوکس رہنا ہوگا۔

**سوال: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، اردو داں طبقے کو ابھرتے ہوئے تکنیکی منظرنامے سے وابستہ کررہی ہے اس ذیل میں آپ کا کیا خیال ہے؟**

جواب: یہ اچھی بات ہے۔ اردو کی ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ دوسرے علوم سے بھی اس کا رشتہ قائم کیا جائے، خصوصاً پروفیشنل کورسوں سے۔ اس سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اقدامات مستحسن ہیں اور ان کی پذیرائی ہر حلقے میں ہورہی ہے۔

**سوال: فروغ اردو کے لیے قومی اردو کونسل کئی اسکیمیں بنارہی ہے مثلاً کتاب میلہ، موبائل وین، بلک پرچیز وغیرہ کیا ان کوششوں سے آپ مطمئن ہیں؟**

جواب: قومی اردو کونسل کی یہ تمام کوششیں اردو کے فروغ میں بے حد اہم کردار ادا کررہی ہیں۔ قومی سطح پر یہ واحد ادارہ ہے جس کی کارکردگی نمایاں نظر آتی ہے۔ مذکورہ اسکیموں کے علاوہ زبان و ادب کی کتابوں کی اشاعت، مختلف اداروں کو مالی تعاون، اہم کتب کے ترجمے، سیمینار، ورک شاپ اور مذاکروں کے انعقاد کے ذریعے قومی اردو کونسل مسلسل اردو کے ہمہ جہت فروغ کی کوششیں کررہی ہے جو لائق صد تحسین ہے۔

**سوال: "اردو دنیا" کے قارئین کو آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟**

جواب: اردو اخبارات و رسائل اور اردو زبان کے فروغ میں کسی بھی حد تک حصہ لینے کی کوشش کیجیے۔

Dept of Urdu
Patna University, Patna-800005 (Bihar)

❑❑❑

**تعلیمی تشکیل نو کے مسائل**

**مصنف: خواجہ غلام السیدین**

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشو ونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشو ونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت: -/96 روپے

**خواجہ میر درد**

**مصنف: ظہیر احمد صدیقی**

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالات زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

آلِ احمد سرور

ہماری مطبوعات

''لفظ'' سے ماخوذ

# میرا مسافر

جب مسافر کسی وادی میں قدم رکھتا ہے
ذہن میں منزلِ مقصود کی تصویر لیے
دل میں کچھ کرنے کے ارمان کی شمشیر لیے
اپنے سرمائے پہ چپکے سے نظر ڈالتا ہے
دیکھتا ہے کہ کسی نے اسے دیکھا تو نہیں

ساتھ ہے عزمِ جواں، طبعِ رواں، ذوقِ تپاں
کتنے خوابوں کا نشہ، کتنے خیالوں کی ترنگ
خس و خاشاک سے دب دب کے ابھرنے کی امنگ
اور پھر راہ پہ یوں دوڑتے ہیں اس کے قدم
جیسے پھولوں میں نسیمِ سحری پھرتی ہے
سینۂ آب پہ کرنوں کی پری پھرتی ہے

ہو مبارک یہ سفر تجھ کو مرے نورِ نظر
گو ترے پاس بہت کچھ نہیں، اک نور تو ہے
بند دروازے اسی نور سے کھل جائیں گے
کتنے آراستہ بے خانوں سے چھلکے گی شراب
فکر کے کتنے نہاں خانوں سے ابھریں گے گلاب

نور کے جام میں مہتاب سما سکتا ہے
روشنی مشرق و مغرب میں بچھا سکتا ہے

1961

□□□

● پروفیسر آلِ احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغزگو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرورصاحب کی زندگی میں تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوقِ جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے جسے قومی اردو کونسل نے شائع کیا ہے۔ 96 صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت 64روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ہماری مطبوعات "جامع اردو انسائیکلوپیڈیا، جلد-7، سائنسی علوم" سے اقتباس

# زمین ایک سیارہ

ہماری زمین کا گولا نہ صرف ایک سیارہ ہے بلکہ اس کا مطالعہ دوسرے سیاروں اور ان کے ذریعے کائنات کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔ زمین کی کمیت (Mass) بڑوسی زہرہ کی سوائی، مریخ کی ساڑھے نو، عطارد کی اٹھارہ اور چاند کی اکیاسی گنی ہے۔ ہاں نظام شمسی کے بیرونی سیارے مشتری، زحل، یورانس اور نیپچون اس سے بڑے یا بہت بڑے ہیں اور سورج کا مقدار مادہ ہماری زمین کا 1/3 3 لاکھ گنا ہے۔ خط استوا پر زمین کا قطر 12756 کلومیٹر ہے مگر قطبین کے درمیان اس سے 43 کلومیٹر کم ہے، کیونکہ وہ اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔

**حرکت :** زمین کے گھماؤ کی میعاد چوبیس گھنٹہ کی تعریف ہے۔ مگر یہ میعاد سورج کے لحاظ سے ہے جس پر زمین کی سورج کی چاروں طرف گردش کا اثر پڑتا ہے، ورنہ پیمائش کے لیے کسی دور کے ستارہ پر اعتبار کریں تو تین منٹ 56 سیکنڈ کم نکلتے ہیں۔ گردش کی میعاد بھی تین طرح نپتی ہے۔ ہمارے شمسی سال کی تعریف موسمی ہے یعنی وہ وقت جو زمین "نقطۂ بہار" (Vemal Equinox) سے چل کر پھر اس تک واپس آنے میں لیتی ہے 365.2422 معیاری دن کے بقدر ہے یعنی 1/4 365 دن سے کچھ کم۔ زمین سورج کے گرد ایک ایلپس میں چکر کاٹتی ہے اور سورج کا مرکز اس کے ایک فوکس پر واقع ہے۔ یہ ایلپس دائرے سے اتنی ہٹی ہے کہ سورج سے زمین کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ (22 جون کو) کم سے کم فاصلہ (22 دسمبر) سے 50 لاکھ کلومیٹر زیادہ ہوتا ہے۔ کہ سورج زمین کے راستے کے عکس پر حرکت کر رہا ہے۔ اس لیے اسے "طریق الشمس" (Ecliptic) کہتے ہیں۔ یہ زمین کے استوائی مستوی (Equitorial Plane) کو خلا میں دو نقطوں پر کاٹتا ہے۔ "نقطۂ بہار" پر سورج اس میدان کو کاٹتا ہوا شمال جانب منتقل ہوتا معلوم ہوتا ہے اور "نقطہ خزاں" پر جنوب کی طرف واپس ہوتا۔ اپنے مدار پر زمین کی گردش کے سبب آسمان پر دور کے ستاروں کے پس منظر میں سورج روزانہ مشرق کی طرف بتدریج ہٹ جاتا ہے، وہ اس کے قطر کا قریب قریب دوگنا ہوتا ہے۔ چونکہ سال میں 365 سے کچھ زیادہ دن ہوتے ہیں اور دائرہ 360 درجوں میں تقسیم کیا گیا ہے، سورج روزانہ قوس ایک درجہ کے قریب ہٹتا معلوم ہوتا ہے، اسی وجہ سے آسمان کا منظر مسلسل بدلتا رہتا ہے۔

طریق الشمس زمین کے استوائی میدان کو قوس 23 درجہ 27 منٹ پر کاٹتا ہے کیونکہ زمین کے گھماؤ کا محور طریق الشمس پر عمودی نہیں، عمود سے اتنا جھکا ہوا ہے۔ اسی جھکاؤ کے سبب سے ہمارے دنوں اور راتوں کا وقفہ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے، موسم بدلتے ہیں اور جب شمالی نصف کرہ میں گرمی ہوتی ہے تو جنوبی نصف کرہ میں سردی پڑتی ہے۔ 22 جون کو شمالی نصف کرہ سورج کی طرف سب سے زیادہ جھکا ہوتا ہے اور اس لیے اس پر سورج کی کرنوں کا جھکاؤ کم سے کم ہوتا ہے اور ان کی تمازت زیادہ سے زیادہ۔ دراصل ان دنوں خط سرطان (Tropic of Cancer) یعنی شمالی عرض البلد 23 درجہ 27 منٹ کی اطراف سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں اور دوپہر میں سورج ٹھیک ہمارے سر پر ہوتا ہے۔ ان کی دونوں طرف ان کا جھکاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اسی طرح 22 دسمبر کو سورج خط جدی (Tropic of Capricorn) یعنی جنوبی عرض البلد 23 درجہ 27 منٹ پر سیدھا چمکتا ہے۔ ان دونوں تاریخوں کے درمیان زمین کے بدلتے جھکاؤ کی بدولت سورج کی کرنوں کی تمازت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ سورج کی سیدھی کرنیں سال بھر مندرجہ بالا دونوں خطوں کے

---

●کونسل نے اردو میں پہلا مکمل اور بین الاقوامی معیار کا انسائیکلوپیڈیا شائع کیا ہے۔ اس کا سارا مواد بڑی دیدہ ریزی اور مشقت کے ساتھ سلیس زبان اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایسی کاوش ہے جو آئندہ کئی نسلوں کو علم و دانش سے مالامال کرتی رہے گی۔ ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور علم دوست قارئین کے لیے ایک نادر تحفہ، ہر جلد اپنے آپ میں مکمل ہے۔ مکمل آٹھ جلدوں پر مشتمل، سات جلدیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کی مجموعی قیمت 1790 روپئے ہے۔ سائنسی علوم پر مبنی اس جلد کی قیمت 200 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

درمیان ہی پڑتی ہیں، اس لیے وہ اتنا گرم رہتا ہے۔ 21 مارچ اور 23 ستمبر کو زمین کا جھکاؤ سورج کی کرنوں پر عمودی ہوتا ہے۔ خط استوا پر وہ سیدھی پڑتی ہیں اور شمالی و جنوبی دونوں نصف کروں کے ایک ہی عرض البلد پر برابر زاویے سے گرتی ہیں۔ ان دو تاریخوں پر قطبین چھوڑ کر پوری دنیا میں رات دن برابر ہوتے ہیں اور موسم معتدل ہوتا ہے، اگرچہ خط استوا سے جتنے دور ہوتے جائیں گرمی اوسط میں اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ دونوں نصف کروں کے بابت یہ بھی کہتا چلوں کہ جنوبی کرہ میں موسم زیادہ شدید ہوتا ہے کیونکہ جب وہ سورج کی طرف جھکتا ہے تو شمالی نصف کرہ کے برخلاف، سورج سے زیادہ قریب بھی ہوتا ہے۔ زمین کی سطح پر گرم ملکوں میں درجۂ حرارت کبھی کبھی 50 درجہ سے بھی اوپر چلا جاتا ہے اور قطبی علاقوں میں سردی منفی 50 سے کچھ زیادہ بڑھ سکتی ہے۔

دوسرے سیاروں کی طرح زمین بھی سورج کے گرد ایک اِلپس پر چکر لگاتی ہے، دائرہ میں نہیں، کیونکہ نظام شمسی کے دوسرے سیارے بھی، نیوٹن کے قانون تجاذب (کائناتی قوتِ ثقل) (Gravitation) کے مطابق، اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں گو کہ سورج سے بہت کم۔ ان ثقلی کششوں سے زمین کی حرکت میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اول زمین کے مدار کا نقطۂ بہار (Vernal Equinox) طریق الشمس کے ساتھ ساتھ مغرب کی جانب پچاس ثانیہ فی سال بڑھتا جاتا ہے، جس سے موسمی سال (Tropical Year) زمین کی گردش سے اصل فلکی سال (Siderial Year) سے 0 0142 دن یا 20 منٹ 24 سیکنڈ چھوٹا ہو جاتا ہے اور ستاروں کے محل وقوع (a s) زمینی نظام ابعاد (Celestial System) میں مسلسل اصلاح پذیر رہتے ہیں۔ دوم، دنیا کے محور کا جھکاؤ اس پر سورج، چاند اور سبھی دوسرے سیاروں کی طرف سے مختلف مروڑ (Torque) عائد کرتا ہے، جن کے مجموعی اثرات سے زمین کا محور شمسی نظام ابعاد کے شمالی قطب کے چاروں طرف اپنے جھکاؤ کے زاویے (قریب 23.5 درجہ قوسی) پر مغرب کی جانب 26,000 سال کا ناچ (Precession) ناچتا ہے۔ آج کل زمین کا محور ''قطب تارہ'' کے قریب سے گزرتا ہے۔ لیکن 14,000 سال بعد اس کے بجائے ''لیرا'' برج کا روشن ترین ستارہ ''ویگا'' قطب تارہ ہو جائے گا۔ ان کے علاوہ اور بھی خفیف اثرات دریافت ہوئے ہیں۔ زمین کے مدار کا نقطہ اقرب الشمس (Prihelion) انھیں اثرات سے ہر سال 4 منٹ 43 سیکنڈ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس نقطے سے ناپنے پر سال فلکی سال کے مقابلے میں اسی قدر زیادہ لمبا ہو جاتا ہے۔

**اندرون اور خلقی تاریخ:**

زمین کے اندرون کا سراغ زلزلہ کی لہروں سے لگا ہے۔ یہ لہریں دو قسم کی ہوتی ہے۔ (1) عام آواز کی میکانکی لہروں کی طرح کی، جو اپنی حرکت کی سمت دبتی اور پھیلتی جاتی ہیں، p لہریں کہلاتی ہیں اور (2) صرف ٹھوس میں پیدا ہونے والی s لہریں جو ٹھوس کی شکل میں کھینچ تان پیدا کرتی ہیں۔ زلزلہ کے مرکز آغاز (Epi-center) سے 103 درجہ قوس تک زمین کے باہر یہ دونوں لہریں آپس میں مل جاتی ہیں۔ 103 سے 142 درجہ تک صرف کمزور p لہریں ملتی ہیں اور 142 سے 180 تک طاقتور p لہریں پھر مل جاتی ہیں لیکن کوئی s لہر نہیں۔ ان لہروں کے تفصیلی مطالعوں سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ زمین کے بیچوں بیچ 1300 کلومیٹر نصف قطر کی اندرونی ٹھوس 'گٹھلی' (Core) ہے جس کا ثقل اضافی (گھن) (Relative Density) 17 کے بقدر ہے۔ اس کے اوپر 2200 کلومیٹر موٹی بیرونی رقیق 'گٹھلی' ہے جس کا ثقل اضافی 10 کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ یہ گھن بالائی زمین کے دباؤ سے ہیں، لیکن ان کا عمدہ ایصال (Conductivity) ان کے لوہے اور نکل جیسی دھاتوں پر مبنی ہونے کا اشارہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان دھاتوں کا قیاس یوں درست معلوم ہوتا ہے کہ رقیق اور برقائے لوہے اور نکل کی گردش سے ہی زمین کا وہ مقناطیسی میدان بن سکتا ہے جو ہمارے مشاہدے میں ہے۔

ان ٹھوس اور رقیق 'گٹھلیوں' کے اوپر 2800 کلومیٹر موٹا 'مچان' (Mantle) ہے جو لوہے، میگنیشیم وغیرہ کے سلی کیٹ مرکبات پر مبنی ہے اور جس کا اضافی گھن 3 سے 6 تک معلوم ہوتا ہے۔ ان سب کے اوپر قریب قریب 35 کلومیٹر اونچی بالائی پرت ہے، جس کا اوسط گھن 3.3 ہے۔ یہ براعظموں میں زیادہ موٹی ہوتی ہے اور پہاڑوں کو سنبھالتی ہے، جبکہ سمندروں کی تہہ میں 10 سے 5 کلومیٹر تک پتلی ہو سکتی ہے۔ اس کے نیچے واقع 'مچان' کا

الائی حصہ پرت کے دباؤ سے پلاسٹک ہوگیا ہے جو نہ پوری طرح ٹھوس ہے نہ رقیق۔ پوری زمین کی پرت مسلسل نہیں، بہت سے چھوٹے بڑے حصوں میں بٹی ہوئی ہے، جنھیں پلیٹیں (Plates) کہتے ہیں۔ یہ پلیٹیں جن پر خشکی اور تری کے علاقے ٹھہرے ہیں، اپنی جگہ قائم نہیں، بلکہ فی سال چند سینٹی میٹر کھسکتی اور بغل کی پلیٹ پر دباؤ ڈالتی ہیں۔ اس حرکت کے لیے توانائی زمین کے اندر موجود تابکار مادوں یا عام ثقلی دباؤ سے آتی ہے، جس سے اپنی طاقت اور قدرتی حالات کے مطابق پرت کے حصے خصوصی طور پر پلیٹوں کے جوڑوں پر، دھنستے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ پلیٹوں کے کنارے جہاں یہ حرکات پیش آتی ہیں، آتش فشانی مظہروں کی خاص جگہیں ہیں۔ ان کے مخدوش خطوط ہندوستان کی مغربی، شمالی اور مشرقی سرحدوں پر واقع ہیں، خلیج فارس سے عراق اور ترکی ہوکر بحیرۂ روم اور وسطی یوروپ سے گزرتے ہیں، مشرقی افریقہ اور سعودی عرب کے مغرب میں واقع ہیں، ملایا اور انڈونیشیا کے سبھی جزیروں سے لے کر فلیپائن کے گرد ہوکر پورے جاپان کے سر پہ اٹھائے ہیں۔ کناڈا، امریکا، میکسیکو کی مغربی سرحد سے لے کر جنوبی امریکا میں چلی کے آخری جنوبی سرے تک پھیلتے ہیں۔

## سیارہ کی تشکیل کی چار منزلیں

زمین کے گولے میں زیادہ گھن کا مادہ اس کے مرکز میں دھیرے دھیرے اتر کے اس وقت ٹھنڈا اور منجمد ہوا ہوگا جب سیارۂ زمین نے اپنی مجموعی ثقلی کشش کے تحت ایک شکل اختیار کر لی ہوگی اور پورے کا پورا گولا ثقلی دباؤ اور تابکاری کی گرمی سے پگھل گیا ہوگا۔ تب سب سے بھاری مادّے مرکز میں، اس سے کم بھاری اس کے گرد او ہلکے سب سے اوپر آگئے ہوں گے۔ سیاروی تشکیل کے اس عام اور پہلے عمل کو تفریق (Differentiation) کہتے ہیں۔ زمین کی بالائی پرت، ہنوز بنتی بگڑتی رہتی ہے، خاص کر سمندروں کی تہہ میں جہاں پلیٹوں کی درزیں اندر سے پگھلا مادّہ ابل کر پھیلنے دیتی رہتی ہیں۔ بحراوقیانوس کے مطالعے بتاتے ہیں کہ پگھلے مادہ کی جمی تہیں مسلسل الٹتے مقناطیسی میدانوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔ گھومتے سورج کا اندرون گیارہ سال میں اپنے مقناطیسی میدان کا رخ بدل دیتا ہے۔ زمین کی طبقاتی تہیں دس دس لاکھ سال میں اس الٹ پلٹ کے اندراج پیش کرتی ہیں۔

سیارہ کی سطح جم کر سخت ہوجانے کے بعد اسے خلا سے آٹکرانے والے شہابوں، دم دار تاروں اور دوسرے سیارچوں کے تصادم سے بڑی تعداد میں واسطہ پڑتا ہے جو اس کی سطح میں چھوٹے بڑے خصوصی شکل کے گڑھے بنا دیتے ہیں۔ یہ پیالے کی طرح کے مدّور ہوتے ہیں جن کے کنارے اور بیچ کے حصے تصادم کے ردعمل میں اوپر اٹھ آتے ہیں اور ان کا قطر سیکڑوں کلومیٹر کا یا اور زیادہ کا ہوسکتا ہے۔ بعض ماہرین ارضیات اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ بحرالکاہل (Pacific Ocean) کے بڑے نشیب اسی طرح پیدا ہوئے ہوں گے۔ سیارہ کی تشکیل کی یہ دوسری منزل ہے اور اسے ''کاسہ نقشی'' (Cratering) کہیں گے، کیونکہ اس میں سطح سیارہ پر ''کاسے'' (Craters) کھدتے رہتے ہیں۔

اس کے بعد تیسری منزل یہ ہے کہ آتش فشانی مادے کثرت سے سطح پر بہیں، اس پر مٹی کی نئی تہیں جمائیں اور ''کاسے'' ڈھانکتے جائیں۔ جو سیارے یا تابع آتش فشانی میں فعال نہیں ہوتے، ان کی سطح پرانی ہوتی ہے اور اس پر کثرت سے ''کاسے'' نظر آتے ہیں۔

چوتھی اور آخری منزل طبقات الارضی (Geologically) طور پر ''زندہ'' سیاروں کی سطح کا آہستہ آہستہ نمو پذیر ہوتے رہنا ہے جیسا کہ ہماری زمین کے معاملے میں ہورہا ہے۔ ہماری زمین کی بالائی پرت شاید پچھلے ساڑھے تین ارب سال سے مسلسل حرکت کررہی ہے، اس کی پلیٹیں ایک دوسرے کو ڈھکیلتی اور ان پر پھسلتی ہیں، پہاڑ بناتی اور براعظموں کو کھسکاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے 20یا25 کروڑ سال پہلے شمالی اور جنوبی امریکا، یوروپ اور افریقہ سے ملے ہوئے تھے اور پھر جنوبی نصف کرہ کی خشکیاں یعنی جنوبی امریکا، افریقہ، جنوبی ہندوستان، آسٹریلیا اور قطب جنوبی کا براعظم (Antarctica) ایک ساتھ ''گونڈوانالینڈ'' بناتے تھے۔ افریقہ کے دباؤ نے جنوبی امریکا کے مغرب میں انڈیس (Andes) پہاڑ ابھارے اور جنوبی ہندوستان کے جنوبی ایشیا پر دباؤ نے ہمالیہ کے سلسلے بنائے، جو ہنوز زیر تعمیر ہیں۔

### فضا

زمین کے بنتے وقت جو ہائیڈروجن، ہیلیم وغیرہ ہلکی گیسیں موجود تھیں، عمل ''تفریق'' کے زمانے میں شدید تپش کے سبب زمین کی قوت کشش سے

نکل بھاگیں۔ لیکن اسی عمل سے زمین کے اندرون واقع مادہ ٹوٹا پھوٹا بھی اور اس میں دبی چھپی کاربن ڈائی آکسائڈ اور بھاپ جیسی گیسیں برآمد ہوئیں اور انھوں نے زمین کا دوسرا ماحول بنایا۔ کچھ عرصے بعد زمین ٹھنڈی ہوئی تو بھاپ نے پانی بن کے سمندر بھر دیے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کچھ اس پانی میں گھلی تو کچھ چونا جیسے مرکبات سے مل کر نامیاتی اور غیر نامیاتی مادوں میں شامل ہوگئی۔ پھر بہت عرصے بعد پیڑ پودے اگے تو سورج کی شعاعوں کے اثر سے انھوں نے اپنی پتیاں باقی بچے کاربن ڈائی آکسائڈ کے کاربن سے بھریں اور آکسیجن کو فضا میں آزاد کر دیا۔ دوسرے کیمیائی اعمال سے یوں ہی نائٹروجن آزاد ہوئی۔ اس طرح کے قدرتی اعمال سے ہمارا موجودہ فضائی ماحول بنا جس میں آج سطح زمین پر حجم کے لحاظ سے 78 فیصد نائٹروجن ہے، جو کیمیاوی طور پر بہت کم فعال ہونے کے باعث کم استعمال ہوتی ہے اور صرف نباتات کے کام آتی ہے، جبکہ فضا کی 20 فیصد فعال آکسیجن ہر طرح کی زندگی کے کام آتی ہے اور بے شمار کیمیاوی اعمال میں صرف ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح ان گیسوں کے ساتھ آکسیجن کا موجودہ توازن قائم ہوا ہے۔ ہوا میں جو دوسری گیسیں موجود ہیں وہ آرگن (1 فیصد)، کاربن ڈائی آکسائڈ (ہزار میں 1/3)، اور بہت کم مقدار میں نیون، ہیلیم، میتھین، کرپٹان وغیرہ ہیں۔

جیسے جیسے کوئی زمین کی سطح سے اوپر اٹھتا ہے، ہوا اور فضا میں کئی طرح کی تبدیلیاں ملتی ہیں۔ اول تو نسبتاً بھاری آکسیجن کا تناسب کم اور نائٹروجن کا زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ کئی میل اوپر جاکے ہلکی ہائڈروجن اور ہیلیم اچھے خاصے تناسب میں ملنے لگتی ہیں۔ دوسرے ہوا کا گھن (Density) 300 کلومیٹر پر سطح زمین کے 6-10 گرام فی مکعب سینٹی میٹر سے بتدریج گھٹ کر اس کا سواں حصہ یعنی 8-10 رہ جاتا ہے۔ سو سے ڈیڑھ سو کلومیٹر بلندی پر ہوا قریب قریب ناپید ہو جاتی ہے۔

تیسری اہم بات یہ ہے کہ سورج وغیرہ سے توانا ذرات (پروٹون، الکٹرون ....) اور شعاعیں (گاما، ایکس اور بالائی بنفشی کرنیں) فضا پر کم و بیش برابر پڑتی رہتی ہیں اور کیمیاوی ٹوٹ پھوٹ کے ذریعے مسان جیسے ذرات بناتی اور مزید الکٹرون نکالتی رہتی ہیں، باہر جو اور اندر مساعد حالات میں یہ الکٹرون مثبت برقیوں سے دوبارہ جڑتے رہتے ہیں۔ اس طرح پوری فضا کم زیادہ ہوتے الکٹرونوں سے بھری رہتی ہے۔ 80،120 اور 280 کلومیٹر بلندیوں پر ان کا گھن غیر معمولی طور پر بڑھ جاتا ہے (یعنی دس ہزار، ایک لاکھ یا دس لاکھ فی مکعب سینٹی میٹر) اور 180 کلومیٹر پر کچھ کم نمایاں۔ ان علاقوں کو بالترتیب D, E, F1 اور F2 منطقوں کا نام دیا گیا ہے۔ ان میں یائی اصناف میں ایٹمی آکسیجن (O)، نائٹروجن (N)، اوزون (O3)، نائٹرک تیزاب (NO) اور برقایا نائٹرک تیزاب (NO+) وغیرہ کا بنتا بگڑتا بھی اہم ہے کیونکہ وہ بیرونی خطرناک ذروں اور شعاعوں سے زمینی زندگی کی حفاظت کرتے ہیں۔

''کرہ اوزون'' 80 سے سو تین سو کلومیٹر بلندی تک ملتا ہے، اور جس کی مبینہ تخریب آج کل فضائی سائنس کی بحث و تشویش کا موضوع ہے۔ برقائے یا بے برقائے نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی کے سالمے بھی مختلف چھوٹی بڑی لہروں کی شعاعیں جذب کر لیتے ہیں اور ان کا دوبارہ اخراج زیادہ لمبی لہروں کی شکل میں ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہماری فضا رنگین روشنی (Visible Light)، قریبی بالا بنفشی اور قریبی زیر سرخ (0.2 سے 1.3 مائکرون تک) کے علاوہ ایک سینٹی میٹر سے 20 میٹر تک لمبی ریڈیو لہروں کو ہی آر پار آنے جانے دیتی ہے۔

ان کیمیاوی اعمال کی وجہ سے فضا میں درجۂ حرارت (تپش) یکساں نہیں گھٹتا بڑھتا۔ سطح زمین سے 15 کلومیٹر اوپر ''ٹروپوسفیر'' تک درجۂ حرارت 100oc گرتا ہے، پھر 40 کلومیٹر تک پھیلے ''اسٹریٹوسفیر'' میں بڑھ کر پہلے جیسا ہو جاتا ہے۔ 'مزوسفیر' میں 10 کلومیٹر بلندی تک پہنچتے پہنچتے دوبارہ منفی 80oc تک گر جاتا ہے اور پھر منطقۂ حرارت (Thermos 300 phere) کلومیٹر کے اوپر ڈیڑھ دو ہزار درجہ تک گرم ہو جاتا ہے۔ درمیان میں 200 کلومیٹر کے آس پاس تپش غیر یقینی رہتی ہے۔

فضا 'نظر آنے والی' رنگین روشنیوں پر کئی طرح اثر ڈالتی ہے۔ ان میں بکھراؤ (Scatter) سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس عمل میں روشنی کی ایک ایک لہر ایک ایک ذرہ (سالمہ وغیرہ) سے بکھرتی اور اپنی سمت بدل کر ادھر ادھر چلی جاتی ہے۔ لہر لمبائی سے بہت چھوٹے ذرے اسے جس عام زاویہ پر پھینک دیتے ہیں وہ ''ریلے قانون'' کے مطابق لہر لمبائی کی چوتھی قوت کے معکوس (الٹے) تناسب میں ہوتا ہے دن میں سورج کی چھوٹی کرنیں جدھر بھی بکھرتی

ہیں ادھر سے دوسرے ذرے انھیں ہماری طرف بھیج دیتے ہیں، اس لیے آسمان چھوٹی کرنوں کے زیر اثر نیلا دکھائی دیتا ہے۔ شام کو یہ بکھری کرنیں زیادہ تر ہم سے دوسری طرف چلی جاتی ہیں اور کم بکھری سرخ روشنی افق کو لال بنا دیتی ہے۔ اس بکھراؤ کی وجہ سے تاروں کی روشنی کچھ مدھم بھی پڑ جاتی ہے۔ پانی کی ہوا میں لٹکی بوندیں (پھوار کے وقت) روشنی کو اندرونی انعکاس (Internal Refraction) سے اپنے رنگین اجزا میں ترتیب دے کر قوس قزح (اندر دھنک) کا منظر پیش کرتی ہیں۔ اچھے حالات میں (جب روشنی وافر اور زاویے موافق) دوسری دھنک بھی نظر آجاتی ہے جو پہلی سے مدھم اور رنگوں میں الٹی ہوتی ہے۔ زمین پر بلند ہوکر گرنے والے فوارے یا جھرنے میں بھی قوس قزح بن جاتی ہے اگر روشنی مناسب زاویوں پر پڑتی ہو۔ آخر میں ایک خفیف سے اثر کا ذکر کروں کہ افق پر ڈوبتا یا ابھرتا تارہ دوربین میں رنگین نظر آتا ہے، کیونکہ وہاں موجود گھنا فضائی ماحول انعکاسی انتشار (Dispersion) پیدا کردیتا ہے، جس سے سرخ رنگ افق سے قریب ہوجاتا ہے اور بنفشی سب سے دور۔

## مقناطیسی میدان

زمین کے گرد (سورج کی طرف زمینی قطر کے دس گنے اور دوسری طرف ہزار گنے فاصلوں تک) ایک ایسا مقناطیسی میدان ملتا ہے جیسے زمین کے اندر کوئی طاقتور مقناطیس رکھا ہو۔ مقناطیس زمین کے اندر موجود رقیق لوہے اور نکل کے برقائے ایٹموں کی زمین کے گھماؤ کے ساتھ گردش کے سبب سے ہی پیدا ہوتا ہوگا، جسے ڈائی نامو (Dynamo) اثر کہتے ہیں۔ زمین کا مقناطیسی محور اس کے گھماؤ کے محور سے 12 درجہ زاویہ پر جھکا ہے اور مقناطیسی قطب گھماؤ کے قطب سے شمال اور جنوب دونوں میں 1340 کلومیٹر کے قریب جدا ہیں۔

## فان ایلن پٹیاں

زمین کے گرد ہوا کا کرہ سو کلومیٹر کے بقدر ہی موٹا ہے، جبکہ زمین کا قطر ساڑھے بارہ ہزار کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ زمین کا مقناطیسی میدان اس کی فضا سے باہر بہت دور تک پھیلا ہے۔ 1958 میں مصنوعی توابع کے ذریعے انکشاف ہوا کہ زمین کی استوائی علاقہ کی اطراف اس کے قطر کے ڈیڑھ گنے فاصلے پر زمین کے چاروں طرف ایک ایسا خول یا پٹی واقع ہے جس میں 5 کروڑ الکٹرون وولٹ توانائی کے پروٹون اور 3 کروڑ الکٹرون وولٹ سے زیادہ توانا الکٹرون حرکت کرتے رہتے ہیں۔ یہ حرکت دو طرح کی ہے: (1) پروٹون مغرب جانب سیکنڈ کے دسویں حصے میں زمین کا چکر کاٹ لیتے ہیں اور الکٹرون مشرق جانب ایک سے دس گھنٹے میں۔ اس کے علاوہ یہ ذرات (2) شمال و جنوب میں زمین کے مقناطیسی خطوط کے ساتھ ساتھ مرغولہ (Spiral) میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی دوسری بیرونی پٹی زمین کے تین اور چار قطر فاصلوں کے درمیان واقع ہے۔ وہ پہلی کی بہ نسبت ہلکی ہے اور اس میں موجود برقی ذرات 1:100 تک کی نسبت میں کم زیادہ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ پٹیاں جیمس اے. فان ایلن کے نام سے مشہور ہیں، جس کے رفقائے کار نے انھیں دریافت کیا، اور جو زمین کے مقناطیسی میدان سے ان علاقوں میں پھنس جانے والے برقی ذرات کی بنا پر وجود میں آئی ہیں۔ ان ذرات کی دونوں قسم کی حرکت برق مقناطیسی ردعمل کے تحت ان کی توانائی کا مظہر ہے۔ یہ پٹیاں یا موٹے چوڑے خول زمین اور اس کے باشندوں کو باہر دور دراز سے مسلسل آتے رہنے والے توانا اور خطرناک ذرات کے صدموں سے بچاتی ہیں، جبکہ زمین کی فضا خطرناک شعاعوں اور بہرحال گھس آنے والے ذروں، دونوں کے خلاف ہدف کا کام کرتی ہے۔

## قطبی روشنی

زمین کا زیادہ تر حصہ خطرناک ذروں کی رسائی سے محفوظ ہے۔ مگر قطبی علاقوں میں مقناطیسی میدان کی نوعیت دوسری طرح کی ہوتی ہے اور تیز رفتار توانا پروٹون اور الکٹرون شمالی اور جنوبی قطب کے منطقوں میں زمین کی فضا تک پہنچ کے اس میں موجود آکسیجن اور نائٹروجن کے سالموں سے ٹکراتے اور انھیں برقاتے ہیں اور برانگیختہ (Excite) بھی کرتے ہیں۔ یہ واقعات قطبین سے 15 یا 30 درجہ قوس تک دیکھنے میں آتے ہیں کہ زمین سے 80 تا 160 کلومیٹر بلندی پر ان علاقوں کی طویل راتوں میں غیر معمولی روشنیاں پیدا ہوئیں۔ ان کو قطبی روشنیاں (Aurorae) کہتے ہیں اور ان کے مطالعوں سے معلوم ہوا ہے کہ یہ کئی کئی بار برقائے آکسیجن، نائٹروجن جیسی گیسوں کے ایٹموں سے خارج ہوتی ہیں۔

سلمان عابد

کیریئر گائیڈنس کالم

# میڈیکل تعلیم کے لیے مسابقتی امتحانات 2006

اکیسویں صدی میں تعلیم اور روزگار کا معاملہ جس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا ہے بالکل اسی طرح مسابقت بھی ان دونوں امور سے بنیادی طور سے جڑی ہوئی ہے۔ چاہے حصول علم کا معاملہ ہو یا حصول روزگار کا، کڑی سے کڑی مسابقت ہر دو جگہ برابر دیکھی جا رہی ہے اور ہر ایک طالب علم کو اسی کڑی مسابقت سے ہو کر گزرنا ہے۔ آج وہی تعلیم زیادہ قابل قبول ہے جس میں درخشاں کیریئر کی ضمانت زیادہ سے زیادہ ہے اور ایسی تعلیم کے لیے طلبہ کی کثرت امڈتی ہے جس کے لیے ریاستی یا قومی سطح کے داخلہ (انٹرنس) امتحانات منعقد کیے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ریاستی سطح کے امتحانات میں کم مسابقت ہوتی ہے جب کہ قومی سطح کے انٹرنس امتحانوں کے لیے زیادہ مسابقت کا طالب علم کو سامنا رہتا ہے۔ مگر اس مسابقتیں صرف اور صرف، صحیح منصوبہ بندی اور بروقت و موزوں تیاری ہی کام آسکتی ہے۔ ذیل میں ملک کے اہم میڈیکل تعلیمی اداروں کی تفصیل دی جا رہی ہے:

## 1. آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس۔ نئی دہلی (AIIMS)

یہ میڈیکل تعلیم کے لیے قومی اہمیت کا حامل ادارہ ہے۔ یہ ایک خود مختار تعلیمی و طبی ادارہ ہے۔ ملک کا ہر اچھا اور قابل طالب علم یہ چاہتا ہے کہ اس کا داخلہ MBBS یا میڈیکل پوسٹ گریجویٹ کورس میں اسی ادارے میں ہو۔

**اعلانیہ:** اس ادارے کا داخلہ اعلانیہ ہر سال دسمبر میں شائع ہوتا ہے۔ فروری کے اواخر تک درخواستیں جمع کرائی جا سکتی ہیں۔

**انٹرنس ٹسٹ:** ہر سال MBBS میں داخلے کے لیے انٹرنس ٹسٹ کا انعقاد جون کے پہلے ہفتے میں کیا جاتا ہے۔

**نشستیں:** 34

**اہلیت:** بارھویں جماعت (انٹرمیڈیٹ)، بایولوجیکل سائنس، فزکس اور کیمسٹری سے 60 فیصد نمبرات سے کامیاب ہوں۔ (ایس سی/ایس ٹی کے لیے 50 فیصد نمبر ضروری ہیں)۔

**طریقۂ امتحان:** ڈھائی گھنٹوں پر مشتمل انٹرنس ٹسٹ ہوتا ہے جس میں 200 نمبروں کے لیے سوالات جنرل کالج، بایولوجی، فزکس اور کیمسٹری سے پوچھے جاتے ہیں۔ رابطے کے لیے پتا:

Admission Controller of Exams
Examination Section
All India Institute of Medical Science (A.I.I.M.S.)
Ansari Nagar, New Delhi-110029
Tel. +91-011-26588500/26588700/26589900
www.aiims.edu.

## 2. آرمڈ فورسیز میڈیکل کالج، پونے (AFMC)

ملک کا یہ ممتاز ادارہ ہے جہاں ہندوستان کا ہر طالب علم داخلہ چاہتا ہے۔ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک معیاری تعلیم اور درخشاں کیریئر کی ضمانت اور دوسرے بہت کم ترین خرچ میں میڈیکل تعلیم کی تکمیل۔ اس کالج کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں داخلے کے ساتھ ہی ملازمت کا یقین ہو جاتا ہے کیونکہ کورس کی تکمیل کے بعد ہر طالب علم کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کمیشنڈ افسر (Commissioned Officer) کی طرح کام کرے۔

**اعلانیہ:** عام طور سے اس ادارے میں داخلے کا اعلانیہ جنوری کے اوائل میں جاری ہوتا ہے۔ درخواستیں جمع کرنے کی آخری تاریخ فروری میں رکھی جاتی ہے۔

**انٹرنس ٹسٹ:** مئی کی پہلی اتوار کو عام طور سے انٹرنس ٹسٹ رکھا جاتا ہے۔

**نشستیں:** 130 (105 لڑکوں کے لیے، 25 لڑکیوں کے لیے)۔

**اہلیت:** انٹرمیڈیٹ یا بارھویں جماعت میں حیاتیات، طبیعیات، کیمیا مضامین میں کم از کم 60 فیصد نمبرات سے کامیابی۔

**عمر:** 17 سے 22 سال کے درمیان عمر ہو۔

**طریقۂ امتحان:** انٹرنس ٹسٹ 200 نمبروں کے لیے منعقد کیا جاتا ہے۔

**رابطہ:**

Officer Incharge (Admission Cell)
Armed Forces Medical College,
Sholapur Road, Pune-411040
Tel: +91-020-26306010/26811205
www.afmcpune.com

## 3. بنارس ہندو یونیورسٹی (BHU)

ملک کی قدیم ترین جامعات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ عالمی سطح پر اس کے کئی کورسوں کی مانگ ہے۔ اس یونیورسٹی میں 33 میڈیکل شعبے قائم ہیں جن میں 10 سوپر اسپیشلیٹی (Super Speciality) کام کر رہے ہیں۔

**اعلانیہ:** عام طور سے داخلہ اعلانیہ فروری کے اوائل میں جاری کیا جاتا ہے۔ فروری کے درمیانی حصے میں درخواستیں بذریعہ ڈاک جمع کی جا سکتی ہیں

شخصی طور پر درخواستیں جمع کرنے کی مہلت مارچ کے اوائل تک رہتی ہے۔

**طریقۂ امتحان:** داخلہ امتحان کو دو حصوں میں منعقد کیا جاتا ہے۔ پہلا مرحلہ اسکریننگ ٹسٹ کے طور پر رکھا جاتا ہے جو مئی کے دوسرے ہفتے میں منعقد کیا جاتا ہے۔ جب کہ دوسرا مرحلہ مرکزی امتحان (Main Exam) کا ہوتا ہے جو جون کے دوسرے ہفتے میں ہوتا ہے۔ معروضی طرز میں 200 نمبروں کے لیے پہلے مرحلے کا امتحان ہوتا ہے۔ 200 نمبروں کے لیے دوسرے مرحلے کا امتحان تفصیلی (Subjective) طرز کے سوالات پر مبنی ہوتا ہے۔

**نشستیں:** جملہ نشستوں کی تعداد 35 ہے۔

**اہلیت:** بارھویں جماعت حیاتیات، طبیعیات اور کیمیا (Biology, Physics, Chemistry) میں 50 فیصد نمبرات سے کامیابی۔

اگر ایس سی/ ایس ٹی ہوں تو 40 فیصد نمبرات کافی ہوں گے۔

**عمر:** طالب علم کی عمر 17 سے 25 سال کے درمیان ہو۔ رابطہ:

Assistant Registrar
Faculty of Medical Science
Banaras Hindu University (BHU)
Varanasi-221005
Tel: +91-0542-2369040
www.bhu.ac.in

### 4. جواہر لال نہرو انسٹی ٹیوٹ فار پوسٹ گریجویٹ میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (JIPMER)

ملک کا یہ قومی حیثیت کا حامل ادارہ ہے جس میں صرف داخلہ ہی طالب علم کے روشن کیریئر کا ضامن ہوتا ہے۔ اس ادارے میں بھی داخلے کے لیے قومی سطح کی مسابقت رہتی ہے۔ مرکزی حکومت کی وزارت صحت و خاندانی بہبود کے زیر انتظام قائم اس ادارے کو پانڈیچیری یونیورسٹی کا الحاق حاصل ہے۔

**درخواست فارم:** عام طور سے فروری اور مارچ میں درخواست فارم جمع کیا جاتا ہے۔ درخواست فارم براہ راست حاصل اور داخل کرسکتے ہیں۔

**انٹرنس ٹسٹ:** مئی کے آخری ہفتے میں انٹرنس ٹسٹ رکھا جاتا ہے۔

**نشستیں:** 75 (عام امیدواروں کے لیے صرف 14 نشستیں مہیا رہیں گی)۔ رابطہ:

Assistant Registrar
Faculty of Medical Science
Jawahar Lal Nehru Institute for Post Graduate Education and Research (JIPMER)
Dhanvantary Nagar,
Pondicherry-605006
Tel: +91-0413-2277278
www.jipmer.org

### 5. کرسچین میڈیکل کالج، ویلور (CMC)

میڈیکل تعلیم میں یہ ادارہ بھی بے حد مشہور ہے۔ عام طور سے ملک کے ہر گوشے سے طلبہ اس ادارے میں حصول علم کے لیے کوشش کرتے ہیں۔ یہاں ایم.بی.بی.ایس. کی تعلیم کی تکمیل کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایم.بی.بی.ایس. کے عام نصاب کی تکمیل کے بعد کمیونیکیشن اور اخلاقیات (Ethics) پر دو علاحدہ مرحلے کی تعلیم مہیا کی جاتی ہے۔

**اطلاعیہ:** مارچ کے اوائل سے درخواستیں جاری کرنا شروع کیا جاتا ہے۔

اپریل کے دوسرے ہفتے تک درخواستیں جمع کرائی جاسکتی ہیں۔

**انٹرنس ٹسٹ:** مئی کے آخری ہفتے میں انٹرنس ٹسٹ منعقد کیا جاتا ہے۔

**نشستیں:** 60

**اہلیت:** بارھویں جماعت حیاتیات، طبیعیات اور کیمیا مضامین کے ساتھ 60 فیصد نمبرات کے ساتھ کامیاب ہوں۔

**طریقۂ امتحان:** تین گھنٹوں پر مشتمل انٹرنس ٹسٹ 120 نمبروں کے لیے منعقد کیا جاتا ہے جس میں فزکس، بایولوجی، کیمسٹری اور جنرل ایبلیٹی کے سوالات شامل ہوتے ہیں۔ رابطہ:

Principal
Christian Medical College (CML),
Vellore-632002,
Tel +91-0416-2222102
www.cmcvellore.ac.in

### 6. آل انڈیا پری میڈیکل انٹرنس ٹسٹ

ہندوستان کے میڈیکل اور ڈینٹل کالجوں میں MBBS اور MDS کے سال اول میں داخلوں کے لیے CBSE کی جانب سے یہ انٹرنس ٹسٹ 14 مئی 2006 کو ملک گیر سطح پر منعقد ہوگا۔

**اہلیت:** بارھویں جماعت (MBIPC) کامیاب 17 سال کی عمر مکمل کرنے والے طلبہ درخواست جمع کرسکتے ہیں۔

**درخواست فارم:** کینرا بنک سے 150 روپئے کی ادائیگی کر کے درخواست فارم حاصل کیا جاسکتا ہے۔

**امتحان کی تاریخ:** 14 مئی 2006۔

**طریقۂ امتحان:** دو مرحلوں میں یہ امتحان رکھا جاتا ہے۔

1. Preliminery 2. Main

پہلا مرحلہ دو گھنٹوں پر مشتمل 200 معروضی سوالات پر مبنی ایک پرچہ سوالات کا ہوگا۔ دوسرے مرحلے میں دو پرچے ہوں گے۔ پہلا پرچہ صبح 10 بجے سے 12 بجے دن تک اور دوسرا پرچہ ایک تا 3 بجے دن تک جاری رہے گا۔ اس امتحان میں جموں و کشمیر اور آندھرا پردیش کے طالب علم شرکت نہیں کرسکیں گے۔

ینیت غیر، استوتی ٹریحان، سمراٹ شرما
"C ایڈونچر" سے اقتباس

# فیصلہ لینا

## 5.1 ریلیشنل اور لوجیکل آپریٹرز

اگر کوئی پروگرام صرف ایک ہی طرح کا آؤٹ پٹ دیتا رہے تو کتنا بور محسوس ہوگا۔ اس لیے ہم کنڈیشنل اسٹیمنٹ دیگر مختلف طرح کے نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔
ذرا سوچیں ہماری زندگی میں کتنی مختلف تبدیلیاں ہوئی ہیں مثال کے طور پر۔

(چونکہ بارش ہو رہی ہے اس لیے میں گھر میں ہوں ورنہ کتے کے ساتھ چہل قدمی کرتا)

"If it is raining I will stay indoors, else I will walk the dog!"

لیکن مختلف مشروط راستوں (قسموں) کے بیان سے پہلے میں مختلف آپریٹرز کا تعارف کرا دوں۔

### ریلیشنل آپریٹرز

پہلی مثال میں "بارش ہو رہی ہے" ایک حالت ہے جبکہ "میں گھر کے اندر ہوں گا" اور "کتے کے ساتھ چہل قدمی کروں گا" مختلف حالات کے تحت لیے گئے فیصلے ہیں۔ پروگرامنگ میں بھی اسی طرح کے نظریے کا استعمال ہوتا ہے۔ جب ہم کہتے ہیں۔

"If x plus 1 is equal to 5, then x equals 4, else it is not equal to 4".

C میں استعمال ہونے والے 6 ریلیشنل آپریٹرز مندرجہ ذیل ہیں۔

| | | |
|---|---|---|
| برابر ہے | == | Equal to |
| برابر نہیں ہے | != | Not equal to |
| کم ہے | < | Less than |
| بڑا ہے یا کم ہے | <= | Less than or equal to |
| بڑا ہے | > | Greater than |
| بڑا ہے یا برابر ہے | >= | Greater than or equal to |

سمجھ لیجیے کہ ریلیشنل آپریٹرز (relational operators) میں زیادہ سے زیادہ دو کریکٹر ہوتے ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں کوئی اسپیس (space) نہیں ہوتی۔ "equal to" ریلیشنل آپریٹرز (relational operators) کا استعمال کرتے ہوئے خیال رکھیں کہ اس کی جگہ اسائنمنٹ آپریٹر (assignment operator) کا استعمال ایک عام غلطی ہے۔

So while x = 4 checks if x is equal to 4, x = 4 assigns 'x' the value 4.

### لوجیکل آپریٹرز

if اور else اسٹیمنٹ میں ایکسپریشن لکھنے یا لوپ (loop) تیار کرنے کے دوران ہیں۔ لوجیکل آپریٹرز (logical operators) کو ریلیشنل آپریٹرز (relational operators) کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔ لوجیکل آپریٹرز کے ذریعے آپ ایک سے زائد حالت کو ٹیسٹ "test" کر سکتے ہیں۔

لوجیکل آپریٹروں کی تین قسموں کا بیان:

● نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ریسورسیز سی۔ایس۔آئی۔آر یونٹ نے طلبہ اور عام شائقین میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے "سب کے لیے آئی ٹی سیریز" کے تحت ایسی کتابیں تیار کی ہیں جو کمپیوٹر سے متعلق بنیادی باتوں سے روشناس کراتی ہیں۔ قارئین "اردو دنیا" کے لیے اس سیریز کی کتاب ""C" ایڈونچر" سے اقتباس پیش ہے۔ اس کتاب کے ایڈیٹر وی۔کے۔گپتا، معاون ڈاکٹر راجیو گپتا اور اردو ایڈیٹر ڈاکٹر رویندر کمار ہیں۔

1. NOT !(expression)

یہ آپریٹر ایکسپریشن کی نفی کرتا ہے۔ اگر ایکسپریشن ٹرو ہوگی تو یہ اسے فالز کر دے گا اور اگر ایکسپریشن کا نتیجہ ''فالس'' ہوگا تو یہ اسے ٹرو کر دے گا۔

2. AND (expression 1) & (expression2)

جب دونوں ایکسپریشن ٹرو ('true') ویلیو لیں گے تب ہی یہ آپریٹر ٹرو (operator true) ہوگا اور اگر کوئی ایکسپریشن فالس ('false') ہوگی تو یہ آپریٹر فالس ویلیو (value) دے گا۔

3. OR (expression`) II (expression2)

اگر کوئی بھی ایکسپریشن (expressions) ٹرو ('true') ہوئی تو آپریٹر ٹرو (operator true) دے گا۔

## 5.2 if اسٹیٹمینٹ

if اسٹیٹمنٹ (statement) کا استعمال بہت آسان ہے۔ if ٹائپ کرنے کے بعد آپ کنڈیشن (condition) کو بریکیٹ میں لکھ دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ اسٹیٹمنٹ لکھتے ہیں جس میں پروگرام پڑھتا ہے کہ 'if' کنڈیشن ٹرو (true) ہے اگر آپ ملٹیپل اسٹیٹمنٹ استعمال کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اسٹیٹمنٹ اور بلاک (statement block) استعمال کرنا ہوگا۔

مثال کے طور پر

```
if (x==4)
printf("x is equal to 4");
}
```

## 5.3 else اسٹیٹمینٹ

اگر کنڈیشن ٹرو (true) نہیں ہے اور آپ اس کے بدلے میں کوئی دوسرا پروگرام نتیجہ else اسٹیٹمنٹ میں ہیں تو ایسی صورت میں "if" کے بعد "else" کا استعمال کریں۔ اس وقت اسے دوبارہ یہاں آپ کو کنڈیشن لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ آپ ایک if اسٹیٹمنٹ یا else اسٹیٹمنٹ بلاک کو کئی مرتبہ استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ایک عام C پروگرام ہے (کافی تو نہیں ہے لیکن ریلیشن اور لوجیکل اسٹیٹمنٹ کو واضح کر دے گا)۔

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int a;
printf("Input an integer and press Enter;\n");
scanf("%d", &a);
if (a%2==0)
printf("%d is a multiple of 2\n", a);
else
printf("%d is not a multiple of 2\n", a);
return 0;
}
```

اس لائن میں جب 1 داخل کیا گیا تو 4 آیا۔

ایک انٹجر (integer) کو ان پٹ (Input) کیجیے اور انٹر (Enter) کیجیے۔

4

4 is a multiple of 2

## نیسٹیڈ اِف (الجھا ہوا)

if یا else, else if کے بعد آپ کو سیمی کولن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ اس کے بعد والے اسٹیٹمنٹ اور اسٹیٹمنٹ بلاک میں سیمی کولن لگانا ضروری ہے۔ اسٹیٹمنٹ کے استعمال کی ایک مثال یہاں دی جا رہی ہے۔ یہ دو نمبروں کا ان پٹ (input) لے کر ان کا موازنہ کرتا ہے اور نتیجہ کوڈ آؤٹ پٹ (output) کر دیتا ہے۔

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int a,b;
printf("Input two integers separated with a space and press Enter;\n");
scanf("%d %d", &a, &b);
if (a==b)
printf("%d is equal to %d.\n", a, b);
else if (a<b)
printf("%d is less than %d.\n", a , b);
else
printf("%d is greater than %d.\d.\n", a , b);
return 0;
}
```

اس طرح آپ پروگرام میں (nested if) اسٹیٹمنٹ بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام میں یوزر (user) کے ذریعے انٹر کیے ہوئے دو نمبروں کا موازنہ کرکے بتاتا ہے کہ آیا ان دونوں کا جمع (sum) اوڈ (odd) ہے یا ایون (even)۔

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int a,b,c;
printf("Input two integers separated with a space and press enter:\n");
scanf("%d %d"  &a, &b);
c = a +b;
if (a==b) {
printf("%d is equal to %d.\n", a , b);
printf("And their sum is even.\n");
}
else if (a<b) {
printf("%d is less than %d.\n", a , b);
if (c%2==0)
printf("And their sum is even.\n");
else
printf("And their sum is odd.\n");
}
else {
printf("%d is greater than %d.\n", a , b);
if (c%2==0)
printf("And their sum is even.\n");
else
printf("And their sum is odd.\n");
}
return 0;
}
```

## اسٹیٹمنٹ بلاک پر غور کریں!

زیادہ وہائٹ اسپیس (White Space) کا استعمال کریں تا کہ انڈینٹیشن (Indentation) کی وجہ سے کوڈ آسانی سے پڑھا جا سکے جیسے خصوصاً اس صورت میں جبکہ کوڈ بہت بڑا ہو اور اس میں کافی if اور else اسٹیٹمنٹ کا استعمال ہوا ہو۔ انڈینٹنگ (indenting) کرنے کی عادت ڈالیے۔ کریکٹروں کا استعمال آپ کو غلطیاں تلاش کرنے اور انھیں دور کرنے میں مددگار ثابت ہوگا (اس عمل کو ڈیبگنگ (debugging) بھی کہتے ہیں)۔

## 5.4 کنڈیشنل آپریٹر

یہ کہنا ممکن ہے کہ "If this condition is true, do this..., otherwise, do this.." ("اگر یہ کنڈیشن صحیح ہے تو اس پر عمل کیجیے — ورنہ اس پر

عمل مت کیجیے'') سب کے سب ایک لائن میں کیا یہ بہت اچھا نہیں ہے؟ ہم نے بہت مشکل سے کیا ہے؟ لیکن میں سمجھتا ہوں یہی مناسب ہے بہرحال کنڈیشن آپریٹر کا طریقہ یہی ہے۔ اوپر بیان کیا گیا اسٹیٹمنٹ C کوڈ میں اس طرح سے بیان کیا جاسکتا ہے۔

```
a?b : c
```

یہاں۔ ایک کنڈیشن اور۔ ایک ایکسپریشن یہاں تک عمل میں آئی ہے جب کنڈیشن زرو ہو ورنہ —c ایکسپریشن عمل میں آئے گی۔ پہلے کی طرح ایک یہ ہے۔

```
(x==10) ? printf("x is equal to 10/n") :printf("x is not equal to 10\n");
```

یہاں پر سیمی کولن کو ذہن میں ضرور رکھیے گا۔ جیسا کہ میں نے کہا b ایک ایکسپریشن ہے اسٹیٹمنٹ نہیں۔ اگر اس کے بعد آپ سیمی کولن رکھ دیں گے تو پروگرام کمپائل نہیں ہوگا۔ جبکہ C کے لیے یہ چیز صحیح ہے۔ کیوں کہ مجموعی طور پر اس لائن میں کنڈیشنل آپریٹر موجود ہے۔ جو کہ ایک اسٹیمنٹ ہے۔

## 5.5 سوئچ اسٹیٹمنٹ

کبھی یوزر نے جو کچھ کیا ہے اس پر nested if کرتے ہوئے آپ کو اپنے پروگرام میں کئی بار سوئچ نکالنے پڑتے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ بہت سے نیسٹیڈ اف اسٹیمنٹ کا استعمال کرسکتے ہیں۔ مگر اس سے کبھی کبھار الجھاؤ پیدا ہوجائے گا۔ اس صورت میں آپ "Switch" اسٹیٹمنٹ کا استعمال کرسکتے ہیں۔ جس پر عمل اس طرح کیا جائے گا۔

```
switch  (expression)
{
case expression 1.
/* one
or more
statements */
case  expression2;
/* one
or more
statements *\
\* more cases if necessary */default:
/* the default statement(s) */
}
```

سب سے پہلے سوئچ کی ایکسپریشن کا معائنہ کیا جاتا ہے پھر یہ عمل اس کیس کی طرف پلٹتا ہے جس کے معائنے کا اس ایکسپریشن کے معائنے سے موازنہ کیا گیا ہے ڈیفالٹ پر عمل کیا جائے گا جب معائنہ شدہ ایکسپریشن کا موازنہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ نہ کیا جائے۔ سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا دکھائی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر۔

```
#include  <stdio.h>
int main()
{
int a;
printf("Input 1,2,3, or 4 and press enter;\n");
scanf("%d",&a);
switch (a)
{
case 1:
printf("You chose number 1\n");
case 2:
printf("You chose number 2\n");
case 3:
printf("You chose number 3\n");
case 4:
```

```
printf("You chose number 4\n");
default:
printf("You chose a number that's not 1,2,3 or 4\n");
}
return 0;
}
```

ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن ایسا ہے نہیں۔ جب آپ ایک نمبر لیتے ہیں تو امید یہ کرتے ہیں کہ جس ایک نمبر کو آپ نے منتخب کیا ہے اسے اسکرین پر پرنٹ ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ کوڈ کا آؤٹ پٹ اس طرح ہے۔

```
Input 1, 2, 3 or 4 and press enter:
1
You chose number 1
You chose number 2
You chose number 3
You chose number 4
You chose a number that's not 1, 2, 3 or 4
```

کمپیوٹر اور دوسرے معاملات کو دیکھے گا اور آخری حد تک پہنچ جائے گا میری بات کا یہی مقصد ہے۔

## بریک اسٹیٹمینٹ

اگر آپ چنے گئے معاملات کے بعد سوئچ اسٹیٹمینٹ میں "Break" کا استعمال کرنا چاہتے ہیں تو اسٹیٹمینٹ کے آخر میں لفظ بریک کو استعمال کیجیے جس کی مثال درج ذیل ہے۔

```
#include <stdio.h>
int main()
int a;
printf("Input 1,2,3 or 4 and press enter:\n");
scanf("%d", &a);
switch (a)
{
case 1:
printf("You chose number 1\n");
break;
case 2:
printf("You chose number 2\n");
break;
case 3:
printf("You chose number 3\n");
break;
case 4:
printf("You chose number 4\n");
break;
default:
printf("You chose a number that's not 1,2,3 or 4\n");
}
return 0;
}
```

اس کا عمل آپ کی امید کے مطابق ہوگا۔

ان پٹ ایک 3,2,1 اور 4 کیجیے پھر انٹر کو دبائیں

1

آپ کا چنندہ نمبر ایک ہی رہے گا۔

□□□

سید فضل اللہ مکرم — کوئز

# اردو زبان و ادب

کوئز کے صحیح جوابات بھیجنے والے قارئین کو بالترتیب پہلا، دوسرا اور تیسرا انعام دیا جائے گا۔ پہلا انعام 500 روپے، دوسرا انعام 300 روپے اور تیسرا انعام 200 روپے پر مشتمل ہے۔ انعام کے طور پر کونسل کی مطبوعات ارسال کی جائیں گی۔ آپ کے جوابات ہمیں اس مہینے کی 15 تاریخ تک موصول ہو جانے چاہئیں۔ (ادارہ)

(1) ہندوستان کا پہلا صحافی؟
(الف) جیمس آگسٹس ہکی (ب) جیمس بانڈ
(ج) جیمس بولٹس (د) جیمس تھامس

(2) ہندوستان کا پہلا مطبوعہ اخبار جو 1780 میں کلکتہ سے بزبان انگریزی شائع ہوا؟
(الف) کلکتہ جنرل اڈوائزر (ب) کلکتہ ایکسپریس
(ج) کلکتہ پریس (د) کلکتہ ٹائمس

(3) اردو کا پہلا اخبار؟
(الف) جام جہاں نما (ب) مراۃ الاخبار
(ج) قومی آواز (د) دہلی اردو اخبار

(4) اردو اخبار کا پہلا ایڈیٹر؟
(الف) مولانا آزاد (ب) منشی سدا سکھ
(ج) ولیم پیٹرسن (د) جان گلکرسٹ

(5) اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ سے کب جاری ہوا؟
(الف) 27 مارچ 1822 (ب) 27 اپریل 1822
(ج) 27 مارچ 1823 (د) 27 جون 1824

(6) ہندوستان میں فارسی کے پہلے اخبار کا نام کیا تھا جس کے مدیر راجا رام موہن رائے تھے؟
(الف) اخبار فارس (ب) شمس الاخبار
(ج) مراۃ الاخبار (د) آئینۂ اکبری

(7) شمالی ہند کا پہلا اور برصغیر کا دوسرا اردو اخبار کون سا تھا؟
(الف) دہلی نامہ (ب) دہلی اردو اخبار
(ج) دہلی اخبار (د) پیسہ اخبار

(8) ہندوستان کا پہلا شہید صحافی کون تھا؟
(الف) سرسید احمد خاں (ب) بہادر شاہ ظفر
(ج) شاہجہاں (د) مولوی محمد باقر

(9) "دہلی اردو اخبار" کے مدیر مولوی محمد باقر کے فرزند تھے؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) ابوالکلام آزاد
(ج) جگن ناتھ آزاد (د) سرسید احمد خاں

(10) مدراس کا پہلا اخبار جو 1848 میں جاری ہوا؟
(الف) آفتاب عالم (ب) کوہ نور
(ج) الہلال (د) اعظم الاخبار

(11) اردو کا پہلا رسالہ کون تھا جو 1837 میں مرزاپور سے جاری ہوا؟
(الف) قرآن السعدین (ب) [illegible]
(ج) خیر خواہ ہند (د) [illegible]

(12) دہلی کالج کی طرف سے شائع ہونے والے پندرہ [illegible] کے مدیر کون تھے؟
(الف) مولوی محمد باقر (ب) [illegible]
(ج) نذیر احمد (د) [illegible]

(13) اردو کا پہلا طبی رسالہ جو حیدرآباد دکن کا پہلا رسالہ ہے؟
(الف) اخبار طبابت (ب) [illegible]
(ج) طبیب (د) [illegible]

(14) "زمانہ" کے مدیر تھے؟
(الف) پریم چند (ب) [illegible]
(ج) دیانرائن نگم (د) [illegible]

(15) اردو کا پہلا گلدستہ؟
(الف) گل ہمدم (ب) [illegible]
(ج) گل صنوبر (د) [illegible]

(16) اخبارات کی آزادی سلب کرنے کی غرض سے 1857 کے بعد نافذ کیے جانے والے قانون کا نام کیا تھا؟
(الف) Anti Journalists Act (ب) Gagging Act
(ج) Censor Act (د) News Paper Act

(17) وہ مشہور اخبار جس میں سرشار کا ناول "فسانۂ آزاد" قسطوں میں شائع ہوا؟
(الف) اودھ اخبار (ب) کوہ نور
(ج) تہذیب الاخلاق (د) اعظم اخبار

(18) سائنٹفک سوسائٹی کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) 1863 (ب) 1865
(ج) 1875 (د) 1857

(19) رسالہ "دلگداز" کے مدیر کون تھے؟
(الف) مولانا عبدالحلیم شرر (ب) ماسٹر رام چندر
(ج) منشی سجاد حسین (د) ان میں سے کوئی نہیں

(20) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یا اخبار سائنٹفک سوسائٹی (1866) کے مدیر تھے؟
(الف) شبلی نعمانی (ب) ڈپٹی نذیر احمد
(ج) سید محمد (د) سید احمد خاں

(21) سرسید احمد خاں نے 1870 میں کون سا رسالہ جاری کیا؟
(الف) تہذیب الاخلاق (ب) تہذیب
(ج) معلم (د) ادیب

(22) وہ کون سا اخبار ہے جس نے باقاعدہ طور پر کارٹون شائع کیا؟
(الف) ملی گزٹ (ب) تہذیب
(ج) اودھ پنچ (د) اودھ نامہ

(23) اخبار انجمن پنجاب کے مدیر تھے؟
(الف) ڈاکٹر لائٹنر (ب) ماسٹر رام چندر
(ج) محمد حسین آزاد (د) حالی

(24) ظریفانہ صحافت میں کس اخبار کو بڑی اہمیت حاصل ہے؟
(الف) شگوفہ (ب) مسکراہٹ
(ج) اودھ پنچ (د) دہلی اردو اخبار

(25) رسالہ "دلگداز" کب جاری ہوا؟
(الف) 1887 (ب) 1888
(ج) 1889 (د) 1890ء

(26) "پیسہ اخبار" کس نے جاری کیا؟
(الف) پنڈت قلندر رام (ب) پنڈت رتن ناتھ سرشار
(ج) منشی محبوب عالم (د) منشی پریم چند

(27) اردو کا پہلا روزنامہ جو 1855 میں کلکتہ سے جاری ہوا؟
(الف) اردو گائیڈ (ب) اخبار جام جہاں نما
(ج) اخبار عالم (د) اخبار عام

(28) دکن کے پہلے روزنامے کا نام کیا ہے جسے سعید احمد زید بلگرامی اور سید حسن بلگرامی نے جاری کیا؟
(الف) پیک آصفی (ب) آئینۂ آصفی
(ج) سخنوران محبوبیہ (د) سیاست

(29) مولانا حسرت موہانی نے کون سا مشہور ماہنامہ جاری کیا؟
(الف) اردو گزٹ (ب) گل تر
(ج) اردوئے معلی (د) قلعہ معلی

(30) "زمیندار" کس کا اخبار تھا؟
(الف) مولانا ابوالکلام آزاد (ب) مولانا محمد علی جوہر
(ج) مولانا ظفر علی خاں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(31) مولانا جوہر نے 1913 میں کس مشہور اخبار کی شروعات کی؟
(الف) زمیندار (ب) ہمدرد
(ج) دکن ریویو (د) الہلال

(32) "The Choice of Turks" کس کا مشہور اداریہ ہے؟
(الف) محمد علی جوہر (ب) ظفر علی خاں
(ج) جواہر لعل نہرو (د) عبدالمجید

(33) مولانا آزاد نے "الہلال" کب جاری کیا؟
(الف) 1912 (ب) 1915
(ج) 1914 (د) 1920

(34) "لوگ ایک آنہ دے کر اخبار خریدتے اور ایک آنہ دے کر پڑھواتے تھے" یہ شہرت کس اخبار کو نصیب ہوئی؟
(الف) مراۃ الاخبار (ب) زمیندار
(ج) ہمدرد (د) کامریڈ

(35) اردو کا پہلا مصور اخبار کون تھا؟
(الف) الہلال (ب) البلاغ
(ج) منصف (د) قومی آواز

(36) تحریک پاکستان کی نمائندگی کرنے والا اخبار تھا؟
(الف) سیاست (ب) نوائے وقت
(ج) زمانہ (د) کوہ نور

(37) اردو کا پہلا اخبار جس نے ٹیلی پرنٹر کا استعمال کیا؟
(الف) انقلاب (ب) خورشید پنجاب
(ج) احسان (د) محب ہند

(38) "الجمعیۃ" کے مدیر کا نام تھا؟
(الف) سید امتیاز علی تاج (ب) مولانا چراغ حسن حسرت
(ج) مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (د) وزیر آغا

(39) "الہلال" کی تعداد اشاعت کتنی تھی؟
(الف) پندرہ ہزار (ب) بیس ہزار
(ج) تیس ہزار (د) چالیس ہزار

(40) انجمن ترقی اردو ہند دہلی کے مشہور ہفتہ وار اخبار کا نام کیا ہے؟
(الف) دعوت (ب) ہماری زبان

(ج) قومی زبان (د) اردو زبان

(41) ہندوستان میں اردو کا کثیر الاشاعت اخبار کون سا ہے؟

(الف) قومی آواز (ب) ہندسماچار

(ج) منصف (د) سیاست

(42) کتاب ''فن صحافت'' کا مصنف کون ہے؟

(الف) سرسید احمد خاں (ب) رحم علی الہاشمی

(ج) پروفیسر محمد عبدالرحیم (د) عابد علی خاں

(43) ''تاریخ صحافت اردو'' کا مصنف کون ہے؟

(الف) عتیق صدیقی (ب) گل کرسٹ

(ج) امداد صابری (د) خلیق انجم

(44) پنڈت جواہر لعل نہرو نے کون سا اردو اخبار جاری کیا؟

(الف) آزادی (ب) نسیم صبح

(ج) احسان (د) قومی آواز

(45) مندرجہ ذیل میں سے کون سا ادبی رسالہ مسلسل ۶۳ سال سے شائع ہو رہا ہے؟

(الف) آج کل (ب) شاعر

(ج) سب رس (د) شمع

(46) ایک لاکھ کی اشاعت والا اردو روز نامہ ہے؟

(الف) منصف (ب) سیاست

(ج) قومی آواز (د) ان میں سے کوئی نہیں

(47) 2001 کے ریکارڈ کے مطابق ہندوستان میں اردو روز ناموں کی تعداد کتنی ہے؟

(الف) 550 (ب) 534

(ج) 1000 (د) 500

(48) اردو میڈیم میں ماس کمیونکیشن میں ایم.اے کورس کس یونیورسٹی میں دستیاب ہے؟

(الف) عثمانیہ (ب) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(ج) حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی (د) مولانا آزاد اردو یونیورسٹی

(49) فاصلاتی طرز پر ''پی جی ڈپلوما ان ماس کمیونکیشن ٹرانسلیشن ٹیکنکس ان اردو'' کی تربیت کس یونیورسٹی میں دی جاتی ہے؟

(الف) حیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی (ب) عثمانیہ یونیورسٹی

(ج) مولانا آزاد اردو یونیورسٹی (د) جواہر لال نہرو یونیورسٹی

(50) 2005 میں کس اردو رسالے کے سو سال مکمل ہوئے ہیں؟

(الف) تہذیب الاخلاق (ب) رہنمائے تعلیم

(ج) آج کل (د) نگار

## ہمیں دسمبر کوئز انعامی مقابلے کے متعدد جوابات موصول ہوئے۔

قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل حضرات کو بالترتیب اوّل، دوم اور سوم انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

1. **بلال عشرت**

معرفت، عشرت بیتاب

جہانگیری محلّہ، زیب کدہ، آسنسول-713302 (مغربی بنگال)

2. **محمد عمران قریشی**

قریشی محلّہ، جے. کے. کالج روڈ،

پرولیا-723101 (مغربی بنگال)

3. **انجم صدیقی**

116، ذاکر باغ، اوکھلا روڈ، نئی دہلی-110025

**انعام یافتگان کو ادارے کی جانب سے مبارک باد۔**

**آپ کے انعامات جلد ہی بذریعۂ ڈاک ارسال کردیے جائیں گے۔**

(ادارہ)

### دسمبر انعامی مقابلے (کوئز) کے صحیح جوابات:

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 1. ب | 2. ج | 3. ج | 4. الف | 5. د |
| 6. ب | 7. ج | 8. ب | 9. ج | 10. د |
| 11. د | 12. د | 13. ج | 14. ب | 15. ب |
| 16. ج | 17. د | 18. ب | 19. د | 20. ج |
| 21. د | 22. ج | 23. ب | 24. ج | 25. ج |
| 26. د | 27. ج | 28. ب | 29. ج | 30. ب |
| 31. ب | 32. د | 33. ب | 34. ب | 35. ج |
| 36. ب | 37. الف | 38. د | 39. ب | 40. ب |
| 41. ج | 42. د | 43. ب | 44. ب | 45. د |
| 46. ج | 47. ج | 48. ب | 49. ج | 50. ب |

روبینہ ناز

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔30

# بڑھتے قدم

**سید محمد مدبر نے بارھویں تک کی تعلیم ایک سرکاری اسکول میں حاصل کی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ایک سال کا ڈپلوما اِن کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کیا اور ابھی ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کررہے ہیں۔ بچپن میں ہی والد محترم کا انتقال ہوگیا تھا لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری ان کی والدہ محترمہ نے بخوبی نبھائی۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئینِ ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہے۔**

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: مجھے کمپیوٹر سیکھنے کا بڑا شوق تھا، مجھے لگتا تھا کہ کمپیوٹر سیکھنے سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور کمپیوٹر سیکھ کر میں ایک کامیاب انسان بن سکوں گا۔ میں نے کمپیوٹر سیکھنے کے لیے پہلے ٹائپنگ کا کورس کیا پھر کمپیوٹر کورس۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: یہاں اردو کے ذریعے یہ کورس کرایا جاتا ہے اور اردو والوں کے لیے یہ بڑی خوشی اور فخر کی بات ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں ہر طرح سے مطمئن ہوں کیونکہ کورس کرنے کے بعد اب میں ایک پرائیویٹ ادارے میں نوکری کررہا ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ جو بھی طلبہ وطالبات قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں سے یہ کورس کررہے ہیں یا کرچکے ہیں ان کو نوکری ملنے کے امکانات روشن ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: اردو داں طبقے کو اچھی نوکری حاصل کرنا اور وہ بھی بغیر کمپیوٹر سیکھے ہوئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ قومی اردو کونسل کے ان سینٹروں کے ذریعے اردو داں طبقہ کورس کرکے نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ کیونکہ دوسرے سینٹروں میں یہ سہولیات نہیں ہیں۔ یہاں اردو سافٹ ویئر کے ساتھ ساتھ ڈیزائننگ وغیرہ کی وجہ سے کام کرنے اور روزگار تلاش کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: بہت ہی اچھا لگتا ہے کیونکہ میری خواہش پوری ہوگئی ہے۔ اب میں کمپیوٹر اور کمپیوٹر سے متعلق انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر اس کی روشنی اور جانکاری سے اردو داں طبقے کو روشن مستقبل کی طرف لے جاسکوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خود اعتمادی اور خود انحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: خود اعتمادی وخود انحصاری میں بہت اضافہ ہوا ہے کیونکہ میں اپنی ماں کے ان جھکتے ہوئے کاندھوں کا سہارا بن سکا ہوں جن کاندھوں نے اب تک میرا بوجھ اٹھایا ہے۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد قیمتی چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتے ہیں؟

جواب: میں ملٹی لنگول ہوں، یہ سوچ کر ہی مجھے ایک انوکھی خوشی ہوتی ہے۔ میں اردو ہی کی وجہ سے ملٹی لنگول بن سکا ہوں کیونکہ دوسرے اداروں سے فارغین طلبہ ملٹی لنگول نہیں ہوتے۔ مجھے اردو، ہندی اور انگریزی زبان میں کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں آتی۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہ تھی؟

جواب: ہاں، میرے لیے فیس ادا کرنا تھوڑا مشکل ضرور تھا۔

□□□

# اردو خبر نامہ

## ''ترجمہ نگاری: فن، روایت اور عوامی ذرائع ابلاغ'' پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 29 نومبر۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جانب سے ''ترجمہ نگاری: فن، روایت اور عوامی ذرائع ابلاغ'' کے موضوع پر سہ روزہ مذاکرے کا افتتاح ایڈورڈ سعید ہال، خیابان اجمل میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کیا۔ ''عوامی ذرائع ابلاغ کی زبان۔ ماضی اور حال'' کے موضوع پر پروفیسر سدھیر پچوری نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ میڈیا ہماری زبان، سوچ اور روحوں پر اس طرح حاوی ہوگیا ہے کہ ہم اس کی پیداوار بن گئے ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے ''ترجمہ نگاری فن اور روایت'' کے موضوع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ترجمہ نگاری انسانی علوم کا اہم حصہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ترجمہ کی تاریخ سترھویں صدی سے باقاعدہ شروع ہوجاتی ہے لیکن اس کو عروج بیسویں صدی میں حاصل ہوا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا بہت نمایاں کردار ہے۔ سید شاہد مہدی نے کہا کہ صحیفوں کا ترجمہ ادبی تراجم سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں صرف معنی ومفہوم کی ترسیل کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ متن کے شایان شان لفظیات کے استعمال کا بھی ہے۔ انھوں نے ترجمہ نگاری کے حوالے سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات کا ذکر کیا۔ سیمینار کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر شہپر رسول نے کہا کہ اعلیٰ تخلیقی فن پارے کے مترجم کے لیے اعلیٰ صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے۔

مذاکرے کے دوسرے دن کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کہا کہ ''ترجمہ صرف دو زبانوں کو جاننے کا نام نہیں بلکہ اس کے کلچر سے بھی پوری طرح واقفیت ضروری ہے۔'' پروفیسر محمد ذاکر نے کہا کہ قاری یا سامع پر ترجمے کا ویسا ہی اثر ہونا چاہیے جیسا اصل کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے حالی سے لے کر نادر کاکوروی تک کے شاعری کے ترجموں پر روشنی ڈالی۔ کمال عبدالناصر نے ترجمے کو ایک ایسے روزن سے تعبیر کیا جس سے صرف زبانوں کا ادب ہی نہیں بلکہ کلچر بھی دوسرے کلچر سے متعارف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ ہمارے یہاں ترجمے کی روایت بہت پرانی ہے لیکن اب تک فن ترجمہ نگاری اور اس کے آداب واصول پر کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ انھوں نے لفظیات میں اضافے کے لیے دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے کی سفارش بھی کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر مجیب رضوی نے کہا کہ میڈیا سے وابستہ افراد کے لیے زبان کا جاننا انتہائی ناگزیر ہے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے کی۔

دوسرا اجلاس پروفیسر تقی حسین جعفری اور ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں ڈاکٹر شافع قدوائی نے ''خبر نگاری کا فن اور روایت'' انجم عثمانی نے ''ٹی وی چینلوں کی زبان۔ امتیاز واعتبار'' ڈاکٹر کوثر مظہری نے ''ریڈیائی ڈرامے کا فن اور روایت'' ڈاکٹر رضوان الحق نے ''1990 کے بعد ہندوستانی فلموں کی زبان'' ڈاکٹر شاہد حسین نے ''اردو میں یک بابی ڈرامے کی روایت اور صورت حال'' اور ڈاکٹر ابن کنول نے ''روایتی ترسیلی ہیئتوں میں زبان کا کردار اور نوٹنکی کے حوالے'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر شہزاد انجم نے کی۔

یکم دسمبر کو مذاکرے کے آخری دن فرحت احساس نے ''معاشرے کی تعمیر و تہذیب میں اخبار کا کردار''، ڈاکٹر خالد محمود نے ''اردو صحافت میں ترجمہ نگاری کی اہمیت اور افادیت'' ڈاکٹر نعمان خاں نے ''اردو اخبارات کی زبان — مزاج و امتیاز'' اور پروفیسر نصیر احمد خاں نے ''اردو میں اصطلاحات کے مسائل'' پر مقالہ پیش کیا۔ اس اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ صحافت گہرے یقین سے پیدا ہوتی ہے۔ اس وقت مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ نثر کے زوال کے عہد میں پیدا ہوئے ہیں جہاں شخصیات میں اخلاقی استحکام کی بہت کمی ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ صحافت کا موجودہ رویہ اگرچہ پیشہ ورانہ ہے مگر اس کا آغاز جامعہ میں ایک مشن کے طور پر ہوا تھا۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔ چوتھے اجلاس میں پروفیسر مجیب رضوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ اس میں پروفیسر اسد الدین نے ''اردو فکشن کے ترجمے کے مسائل'' اور ڈاکٹر ظہیر رحمتی نے ''اردو میں ادبی ترجمے کی روایت اور مسائل'' پر مقالہ پڑھا۔ صدارتی تقریر میں پروفیسر عبدالحق نے ترجمے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ سیمینار کا اختتامی اجلاس پروفیسر شمیم حنفی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں روس کی ممتاز اسکالر ڈاکٹر لدمیلا واسیلوا نے بھی شرکت کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا بڑا حصہ ترجمے کے ذریعے روس میں منتقل ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ترجمے کے ذریعے نثر کو سمجھا جاسکتا ہے لیکن شاعری کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ انھوں نے اردو اور روسی زبان کے ترجمے کے فروغ کی سفارش کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اختتامیہ کلمات پیش کیے اور ڈاکٹر شہپر رسول نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

## امیر خسرو کی حیات و کمالات پر مذاکرہ

● نئی دہلی، 21 نومبر۔ خواجہ ہال، بستی حضرت نظام الدین میں طوطیٔ ہند حضرت امیر خسروؒ کے 701 ویں سالانہ عرس کے موقعے پر ''امیر خسروؒ — حیات و کمالات'' کے زیر عنوان منعقد مذاکرے میں اظہار خیال کرتے ہوئے شرکا نے کہا کہ انسان دوستی امیر خسرو کے کلام کی روح ہے۔ جلسے کی صدارت جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر ڈاکٹر شمیم احمد، ڈاکٹر سید فاروق اور قرۃ العین حیدر نے کی جب کہ نظامت کی ذمے داری پروفیسر اختر الواسع نے ادا کی۔ خواجہ حسن نظامی میموریل سوسائٹی کی طرف سے منعقدہ اس مذاکرے کے روح رواں خواجہ حسن ثانی نظامی نے افتتاحی تقریر میں کہا کہ لسانیات، شاعری، کلچر، تصوف اور ہندوستانیت وغیرہ کے حوالے سے امیر خسرو فن کمال کا درجہ رکھتے تھے۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے ''عوامی ادب اور امیر خسروؒ کا ہندوی کلام'' اور پروفیسر ماجدہ اسد نے ''انسان دوستی اور امیر خسروؒ'' پیش کیا۔ قاضی عبید الرحمن ہاشمی نے امیر خسروؒ کو تصوف کے عملی پہلو پر یقین رکھنے والا بتایا۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے کہا کہ تصوف بلاتفریق مذہب و مسلک دلوں کو جوڑتا ہے اس لحاظ سے صوفیانہ کردار میں پایۂ تکمیل کے حامل حضرت امیر خسروؒ نے انسانیت اور انسانوں میں باہمی خلوص و محبت کا پیغام دیا۔ روس کی اردو ادیبہ محترمہ لدمیلا واسیلیوا نے بھی مقالہ پیش کیا۔

**(قومی آواز، دہلی)**

## فیض پر لدمیلا واسیلیوا کا خطبہ

● دہلی، 16 نومبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی طرف سے ٹیگور ہال میں غالب میموریل خطبہ پیش کرتے ہوئے روس کی ممتاز ادیبہ ڈاکٹر لدمیلا واسیلیوا نے فیض احمد فیض کی شاعری پر روس کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ ابتدا میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر ابن کنول نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر لدمیلا ماسکو میں انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے شعبۂ ادب میں اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ انھوں نے روسی زبان میں فیض، حالی، غالب اور متعدد دوسرے موضوعات پر کام کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں اقبال، غالب، حالی اور فیض کے علاوہ مختلف دیگر موضوعات پر مقالے تحریر کیے ہیں اور غالب، فیض، فراق، جوش، مجروح، مجاز کے کلام کے علاوہ فسانۂ عجائب، غبار خاطر، آخر شب کے ہم سفر، نادید اور متعدد اردو منتخب افسانوں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر لدمیلا واسیلیوا نے اپنے خطبے میں کہا کہ فیض کا روس سے بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ پہلی بار 1958 میں ماسکو آئے، اس کے بعد روس اور وہاں کے لوگوں سے ان کی محبت زندگی کے آخری وقت تک قائم رہی۔ انھوں نے سوویت یونین کی تمام ریاستوں سے تعلق رکھا۔ فیض کو لینن ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد ان کے کلام کا روسی زبان میں ترجمہ شائع ہوا اور وہ کتاب روس میں بہت مقبول ہوئی۔ ڈاکٹر لدمیلا نے کہا کہ فیض کی نظموں کے ترجمے کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ روسی شعرا کو ان کا انداز اور ان کے موضوعات اپنے محسوس ہوتے تھے۔ فیض مجاہد امن تھے۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر محمد حسن نے فیض کی شاعری کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے شکریہ ادا کیا۔ اس محفل میں جناب حسن ثانی نظامی، پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر عتیق اللہ، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، پروفیسر شریف حسین قاسمی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے علاوہ دہلی یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور میرٹھ یونیورسٹی کے متعدد اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔

**(ڈاک سے)**

## مذاکرہ ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور درپیش مسائل''

● گیا (بہار)، 27 نومبر۔ انجمن ترقی اردو، ضلع گیا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے مخدوم محی الدین ہال میں ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور درپیش مسائل'' کے عنوان سے ایک مذاکرہ منعقد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر عبد المغنی، طیب عثمانی، سرتاج علی خاں اور مشتاق احمد نوری نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبد المغنی نے کہا کہ بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان کا درجہ 1980 سے حاصل ہونے کے باوجود اس کے مسائل میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر اور بہار اردو اکادمی کے سابق سکریٹری جناب مشتاق احمد نوری نے اپنا مقالہ بہ عنوان ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور بہار اردو اکادمی کا کردار'' پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اکادمی ابتدائی اردو تعلیم کے لیے کچھ ٹھوس منصوبے مرتب کرے اور سنجیدگی سے ان پر عمل درآمد ہو تو اردو کے مسائل بہت حد تک حل ہو سکتے ہیں۔ سید عبد المعین نے سروشکشا ابھیان کے تحت اردو زبان کو دی جانے والی مراعات اور کارگزاریوں سے واقف کراتے ہوئے بتایا کہ اس مہم کے تحت کئی اردو اسکولوں کو عمارت، کتابیں اور دوسری سہولیات مہیا کرائی گئی ہیں تاکہ بچے ابتدائی سطح سے اردو کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب متوجہ ہوں۔ عبد القادر نے ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور میڈیا کا کردار'' ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی نے ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور اردو والوں کی نفسیات'' سرتاج علی خاں ایڈوکیٹ نے ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور عدالت کا کردار'' اور سید فضل وارث نے ''بہار میں اردو دوسری سرکاری زبان اور مگدھ ڈویژن کی خدمات'' کے زیر عنوان

مقالے پیش کیے۔ سیمینار کی نظامت انجمن ترقی اردو، گیا کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر سید احمد قادری نے کی۔

اس مذاکرے میں ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن، ڈاکٹر حسین الحق، ڈاکٹر م.ق. خاں، ڈاکٹر غلام قادر، ڈاکٹر خورشید احمد خاں، ڈاکٹر غلام صمدانی، ڈاکٹر احمد حسین آزاد، منیر قمر منیر، پروفیسر تاج انور، ڈاکٹر بدیع الزماں، ڈاکٹر شکیل احمد خاں، احسان دانش، شاہد اختر، شاہد اقبال، عبدالمنان خاں، ڈاکٹر محمود سعید خاں، شعیب وہاب، ڈاکٹر شرافت علی شرافت وغیرہ کے علاوہ بڑی تعداد میں اساتذہ، وکلا، صحافی اور سماجی کارکنان نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

## مجاز کی یاد میں جلسہ

● نئی دہلی، 5 دسمبر۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو اکادمی، دہلی کی جانب سے ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز کی پچاسویں برسی پر ایڈورڈ سعید ہال میں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرے کا افتتاح کرتے ہوئے مجاز کے دیرینہ رفیق اور ممتاز ادیب پروفیسر محمد حسن نے مجاز کی شخصیت اور ان کی بذلہ سنجی کے حوالے سے گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ مجاز پوری طرح نہ شاعر رومان ہیں اور نہ شاعر انقلاب بلکہ انقلابی اور حسیاتی شاعری کا سنگم ہیں۔ پروفیسر مشیر الحسن نے کہا کہ مجاز کو صرف علی گڑھ سے منسوب نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ اردو شعر و ادب کی مشترکہ میراث ہیں۔ اس موقعے پر انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں مجاز کی تحریری و تصویری نوادرات پر مشتمل نمائش کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ادیبوں اور شاعروں کا آرکائیو بنانے کا کام شروع کردیا ہے، جس میں آٹھ لوگوں کی تحریریں، تصویریں، کتابیں اور دیگر نادر اشیا آچکی ہیں۔ اس موقعے پر مجاز کی بہن حمیدہ سالم نے کہا کہ میں آج جو کچھ بھی ہوں وہ مجاز کی دین ہے۔ انھوں نے کہا کہ مجاز کو میری تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی اور انھی کی وجہ سے میرا تعلیمی سلسلہ جاری رہا۔ ممتاز شاعر اور مجاز کے بھانجے نغمہ نگار جاوید اختر نے کہا کہ میری ذہنی تربیت اور شاعری سے دلچسپی کا سبب مجاز تھے۔ کمال احمد صدیقی نے کہا کہ مجاز نے اپنی شاعری کو کبھی شہرت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ رفعت سروش نے مجاز کی حیات اور ان کی زندگی پر ایک دلچسپ مقالہ پڑھا۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر قمر رئیس نے کہا کہ مجاز نے اپنے زمانے میں عوام و خواص دونوں کو متاثر کیا اور آج بھی ان کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ اس موقعے پر محترمہ زرینہ بھٹی اور صہبا علی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر وہاج الدین علوی نے جلسے کی نظامت کی۔ اس موقعے پر قرۃ العین حیدر، مجاز کے اہل خانہ، اکھلیش متل، پروفیسر صغریٰ مہدی، پروفیسر رفاقت علی، پروفیسر فیضان احمد، ڈاکٹر شاہد پرویز، ہمایوں ظفر زیدی اور انجم عثمانی کے علاوہ شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ اور طلبہ بڑی تعداد میں موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

## یوم سرسید کا انعقاد

● پونہ، 23 اکتوبر۔ اعظم کیمپس میں منعقدہ یوم سرسید میں جناب اختر الواسع نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی جبکہ صدارت ظہیر قاضی نے کی۔ محترمہ ممتاز پیر بھائی (صدر انجمن ترقی اردو ہند، پونے) نے خطبۂ استقبالیہ میں تحریک علی گڑھ کو ایک تعلیمی سنگ میل قرار دیتے ہوئے سرسید کے افکار و نظریات کو بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی جانب توجہ دلائی۔ جناب منور پیر بھائی (چیئرمین حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) نے سرسید کی زندگی کا مختصر خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس تحریک نے مسلمانوں کے اندر نیا جوش، ولولہ، نئی زندگی اور سب سے بڑھ کر قومی جوش پیدا کیا۔ مہمان خصوصی نے اپنی تقریر میں کہا کہ سرسید کے حوالے سے ہمیں حال و مستقبل پر نگاہ ڈالنا چاہیے۔ درحقیقت ہم سرسید سے بہت پیچھے ہیں جہاں سے نشان منزل یقین و گمان کے دھندلکوں میں گم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ سرسید نے ہمیں عمل کا جو راستہ دکھایا تھا، ہم اسے نہیں اپنا سکے۔

جناب ظہیر قاضی نے اس موقعے پر سرسید کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے تعلیمی خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنے کی اپیل کی۔ سید سعید اور یونس خاں نے ترانۂ علی گڑھ پیش کیا۔ محترمہ عابدہ انعامدار کے رسم شکریہ پر جلسہ اختتام پر پہنچا۔ (ڈاک سے)

## مولانا آزاد کی یاد میں جلسہ

● حیدرآباد، 12 نومبر۔ ''ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں جن عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیتوں نے جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کو نمایاں مقام حاصل ہے۔'' اس خیال کا اظہار حسینی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، نور خاں بازار، حیدرآباد کی جانب سے پریس کلب بشیر باغ میں منعقدہ سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے جناب محمد خلیل الرحمن سابق ایم پی، انچارج اے. پی. سی. سی. اقلیتی ڈپارٹمنٹ نے کہا کہ جب جدوجہد آزادی کی قیادت کرنے والی کانگریس پارٹی میں قیادت کی رسہ کشی چل رہی تھی ایسے نازک وقت میں مولانا آزاد نے اہم کردار ادا کرتے ہوئے اسے پھوٹ سے بچایا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں مولانا آزاد کے تعلق سے کانگریسیوں میں اعتماد پیدا ہوا اور انھیں کانگریس کی صدارت سونپی گئی۔ مولانا آزاد جس وقت کانگریس کے صدر منتخب ہوئے ان کی عمر صرف 35 سال تھی۔ انھیں سب سے کم عمر صدر کانگریس ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ جناب میر کمال الدین علی خاں نے جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کے کردار پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے علمی اور فکری نظریات کے ذریعے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کی

تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے مسلمانوں کو نیا حوصلہ دیا۔ چیف ایڈیٹر ہفت روزہ ''استقبال'' اور کنوینر سیمینار نے کہا کہ مولانا آزاد متحدہ ہندوستان میں ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھاتے رہے۔ آج ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کاز کو مزید آگے بڑھائیں۔ ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ، ضیا حسین آزاد، ایم اے سمیع اور نانک سنگھ نشتر نے بھی جلسے کو خطاب کیا۔ اس موقعے پر حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ 11 نومبر (یوم پیدائش بھارت رتن مولانا ابوالکلام آزاد) کو یوم قومی تعلیم کے نام سے موسوم کرتے ہوئے ملک گیر سطح پر تقاریب کا انعقاد عمل میں لائے۔

(ڈاک سے)

## مولانا آزاد کی یاد میں جلسہ

● اندور۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے 117ویں یوم پیدائش پر مولانا ابوالکلام آزاد اکادمی، اندور نے ایک جلسہ منعقد کیا جس میں ہندوستان ٹائمس کے سینئر صحافی اروند موہن، مجاہد آزادی پدم شری بابولال پٹودی اور ڈاکٹر راحت اندوری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جلسے کو خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اکادمی کے چیئرمین افتخار انصاری نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ وہ مولانا آزاد کے یوم پیدائش کو ہندوستان کی دوسری عظیم شخصیتوں کی طرح قومی سطح پر منائے جانے کی پیش رفت کرے۔ جناب اروند موہن نے کہا کہ جدوجہد آزادی میں مولانا آزاد کی خدمات کسی بھی دوسرے لیڈر سے کم نہیں ہیں لیکن افسوس کہ انھیں آہستہ آہستہ بھلایا جارہا ہے۔ اکادمی کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مولانا کی زندگی کے ہر ایک گوشے کو ماہرین کے تعاون سے عوام الناس کے سامنے لایا جائے تاکہ مولانا کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

جلسے میں بڑی تعداد میں شہر کی مشہور شخصیات خصوصاً افتخار انصاری، امتیاز احمد، راجو سونی، حاجی صابر شیخ، حافظ صدیق، شاکر زبیری، حاجی سلیم، اوصاف حسن، حافظ ابرار، صغیر ایڈوکیٹ، عامر کھوکر، رتن پانودی، کے کے مشرا، چنی لال وادھوانی، کامریڈ آفاق، ڈاکٹر عزیز اندوری، عزیز عرفان، ڈاکٹر حدیث انصاری، پیارے محمد قریشی، الیاس پہلوان، حاجی غلام نبی انصاری، مشتاق پیر محمد، بشیر منصوری اور ڈاکٹر نظام الدین نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

## مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی تشکیل نو کا مطالبہ

● مالیگاؤں، 19 نومبر۔ ''یوم اردو'' کے موقعے پر انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ مالیگاؤں کی جملہ تعلیمی، علمی، ادبی انجمنوں، عصری تعلیم گاہوں، صحافتی اداروں نیز اردو اخبارات کے مدیران، پریس کے مالکان کی تائید وحمایت کے ساتھ حکومت مہاراشٹر اور متعلقہ محکموں کے ذمے دار افسران کی خدمت میں درج ذیل مطالبات پیش کیے گئے ہیں۔

☆ ''مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی تشکیل جلد از جلد کی جائے۔ بورڈ اراکین کے انتخابات میں تعلیمی، علمی، ادبی، صحافتی حلقوں سے نمائندگی لی جائے۔ ریاست کے تمام اردو علاقوں کی نمائندگی کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں سے نمائندوں کا انتخاب کیا جائے۔

☆ اکادمی کی تشکیل نو کے ساتھ ساتھ اکادمی کی کارکردگی پر مشتمل سہ ماہی جائزہ رپورٹ اور اکادمی کے ادبی مجلے ''امکان'' کی ہر ماہ اشاعت کو بھی لازمی قرار دیا جائے۔ ''امکان'' کے ادارتی بورڈ میں ارکان اکادمی کے علاوہ ریاست کے معروف شعرا، ادبا اور صحافیوں پر مشتمل ایک بورڈ کو بھی معاون بنایا جائے اور ''امکان'' کے قلم کاروں کو معقول معاوضہ دیا جائے۔ ادب اطفال کی آبیاری کے لیے بچوں کا ایک ماہنامہ بھی شائع کیا جائے۔

☆ مہاراشٹر سرکار کے ترجمان اور سرکاری اسکیموں اور منصوبوں سے عوام الناس کو متعارف کرانے والے آرگن ''لوک راجیہ'' کے علاوہ دیگر زبانوں کے ایڈیشن کی اشاعت بند ہے جس میں اردو زبان کا ''قومی راج'' جو کہ آغاز اشاعت پر پندرہ روزہ تھا پھر ماہنامہ کیا گیا بھی شامل ہے جس کے باعث اردو داں طبقہ نہ صرف ایک سرکاری ترجمان سے محروم ہے بلکہ سرکار کی عوامی فلاحی اسکیموں، اقدامات اور منصوبوں سے ناواقفیت کی بنا پر فیض پانے سے بھی محروم ہے۔ لہٰذا لوک راجیہ مراٹھی کے اردو ایڈیشن ''قومی راج'' کی اشاعت دوبارہ شروع کی جائے اور پابندی سے ہر ماہ شائع کیا جائے۔

☆ ایسے تمام اردو اخبارات (روزنامے، ہفت روزہ) جو کہ گذشتہ ایک سال سے نہایت پابندی سے شائع ہو رہے ہیں ان کی ایک سالہ کارکردگی کا جائزہ لیتے ہوئے ان کو ''سرکاری منظور شدہ لسٹ'' میں شامل کرنے کے عریضے قبول کیے جائیں اور فوری کارروائی کرتے ہوئے ان کو ''سرکاری منظور شدہ لسٹ'' میں شامل کرتے ہوئے ان کی معاونت کی جائے۔ نیز جن اخبارات کے مدیران کے ایکریڈیشن کارڈ اب تک منظور نہیں کیے گئے ان کے عریضوں پر فوری طور پر فیصلہ لیتے ہوئے حقدار کو ایکریڈیشن کارڈ دیے جائیں۔

☆ بہت سارے سرکاری اور نیم سرکاری محکمات، سرکاری لسٹ میں شامل اردو اخبارات کے ساتھ سوتیلا برتاؤ کرتے ہیں۔ یا تو اشتہارات نہیں دیتے یا منظور شدہ ریٹ تسلیم نہیں کرتے۔ اشتہارات کی تقسیم میں بھی جانب داری اور ناانصافی برتی جاتی ہے۔ لہٰذا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ایسے تمام سرکاری و نیم سرکاری چھوٹے بڑے اداروں کو لسٹ میں موجود بھی اخبارات کو اشتہارات ان کے سرکاری ریٹ کے مطابق دینے کا پابند بنایا جائے۔

☆ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے ایک سابقہ بورڈ کے چیئرمین ریاستی وزیر پروفیسر جاوید احمد خاں نے ممبئی شہر کے باندرہ، ماہم علاقے میں ایک ''اردو گھر'' کی تعمیر کا منصوبہ اتفاق رائے سے بنایا اور منظوری بھی حاصل کی تھی، اس کی

تعبیر کا خواب پورا کیا جائے۔

☆مہاراشٹر کے تمام ایسے علاقے جن میں اردو داں طبقے کی اکثریت ہے ان کی تعلیمی ترقی کے لیے اردو اسکولوں کے قیام کو معتبر بنایا جائے۔ جن اداروں نے اسکول کھولنے کی اجازت طلب کی ہے ان کو منظوری دی جائے۔ حکومت سرپرستی کا فریضہ انجام دے، اور اپنی مکمل گرانٹ اسکول کے جملہ لوازمات مع کمپیوٹر اور تمام ضروریات کی بھی تکمیل کرے۔ سرکاری اسکولوں میں اردو مدرسین کی تمام خالی جگہوں کو فوری طور پر پر کر کے اردو ذریعہ تعلیم کو فروغ دیا جائے۔

☆مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے تمام ڈگری کورسوں کو جس طرح دیگر ریاستوں نے اپنی منظوری دی ہے اسی طرح حکومت مہاراشٹر بھی منظوری دے بالخصوص ڈگری کورس بی ایڈ کو بھی ریاست مہاراشٹر میں منظوری دی جائے۔

☆مہاراشٹر میں رہتے ہوئے اردو زبان و ادب نیز تعلیم کے میدان میں اپنی خدمات پیش کرنے والے سبکدوش اردو مدرسین، علمی، ادبی، صحافتی خدمات انجام دینے والے معمر و بزرگ شعرا، ادبا، صحافیوں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ہر ماہ معقول وظیفہ دیا جائے۔ نیز جو پیرانہ سالی کے باعث علیل ہوں ان کو علاج کے لیے معقول فنڈ دیا جائے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مہاراشٹر سرکار کی جانب سے دیے جانے والے ''مولانا ابوالکلام آزاد'' صحافتی ایوارڈ کی تقسیم میں بھی تسلسل برقرار رکھا جائے۔

☆ضلع ناسک، ضلع جلگاؤں کے آکاشوانی ریڈیو اسٹیشن پر اردو پروگرام آفیسر کا تقرر کر کے ہر ہفتے ایک گھنٹے کا اردو پروگرام نشر کیے جانے کا فوری انتظام کیا جائے۔ (ڈاک سے)

## اردو اساتذہ کے لیے ورکشاپ

● بنگلور، 23 نومبر۔ کرناٹک اردو اکادمی کی طرف سے منعقدہ، اردو اساتذہ کے دس روزہ وسعت ساز کورس اور ورکشاپ کے چوتھے دن پرائمری اسکولوں کے اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے مشہور صلاح کار ڈاکٹر علی خواجہ نے کہا کہ سب سے اچھا استاد وہ نہیں ہے جو اپنے مضمون میں ماہر ہو بلکہ وہ ہے جو اپنے اخلاص، حسن سلوک، سوجھ بوجھ اور اپنے طلبہ سے گہری دلچسپی کے باعث ان کے دلوں میں گھر کر لے۔ استاد کی جسمانی حرکات وسکنات بھی ایسی دلپذیر ہونی چاہئیں کہ کم سن طالب علم اس سے گہری یگانگت محسوس کرے۔ ایک بار بچہ اپنے استاد کے ساتھ پسندیدگی کا ایسا رشتہ قائم کر لے تو پھر مشکل سے مشکل مضمون دل و جان سے سیکھنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ استاد کو اپنا کام بیزاری، بے دلی، زبردستی یا ناگواری سے انجام نہیں دینا چاہیے۔ بچوں پر استاد کے رویے کا گہرا اور غیر شعوری اثر پڑتا ہے۔ استاد کو اپنی گفتگو، اپنے لباس، اپنی چال ڈھال، اپنی حرکات و سکنات، اپنے طرز تدریس، بچوں کے ساتھ سلوک غرض ہر بات میں محتاط رہنا چاہیے کہ بچے انجانے میں استاد کی ہر بات کو مثال سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسرے سیشن میں مہاراج کول نے اردو صوتیات کے بارے میں نئی معلومات فراہم کیں اور اردو زبان کے رسم خط کی خوبیوں کو نمایاں کیا۔ انھوں نے کہا کہ اختصار اور امتیاز اردو رسم خط کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مثلاً 'ا' کی ایک شکل کو صرف نقطوں اور ہائے دوچشمی کے فرق سے ہم پا، پھا، با، بھا لکھ سکتے ہیں جب کہ دوسری زبانوں میں ہر حرف کے لیے ایک الگ شکل ہے۔ آدھے حروف کی قائم مقامی کی وجہ سے ہم بڑے سے بڑا لفظ کم سے کم وقت میں لکھ لیتے ہیں۔ ورکشاپ کے آخری حصے میں ڈاکٹر کول نے اساتذہ سے تکلمی آوازوں کے مخارج کی عملی مشقیں کرائیں۔ شام کے سیشن میں ڈاکٹر اقبال النسا نے اساتذہ کو خطاب کیا۔

(ڈاک سے)

## انجمن ترقی اردو گلبرگہ کا ادبی اجلاس

● گلبرگہ، 27 نومبر۔ ''اردو میں جدیدیت کے دور کے خاتمے اور مابعد جدیدیت کی باتیں قبل از وقت ہیں، کیونکہ جس طرح آزادئ اظہار اور نظریاتی تسلط کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے جدید افسانہ نگاروں اور شاعروں نے ترقی پسند تحریک کو پوری طرح مسترد کر دیا تھا ایسا کوئی فنی یا فکری استرداد، مابعد جدیدیت سے خود کو وابستہ کرنے والے کسی قلم کار نے نہیں کیا ہے اور اس کے استرداد کا فی الحال کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ لہٰذا یہ رجحان ابھی اپنے تشکیلی دور میں ہے اس میں بیانیہ کی واپسی اور علامت نگاری سے گریز یا واضح ترسیل کے رواج کو جدیدیت کے مکمل خاتمے سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، یہ چیزیں جدید ادب میں پہلے ہی سے موجود ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار ممتاز ادیب و صحافی جناب حامد اکمل نے بندہ نواز ایوان اردو میں انجمن ترقی اردو، گلبرگہ کے ماہانہ ادبی اجلاس میں اپنے صدارتی خطاب کے دوران کیا۔ انھوں نے اجلاس میں پیش کردہ صادق کرمانی کے افسانے ''اجنبی'' اور ڈاکٹر اقبال کے مضمون ''مابعد جدید اردو افسانہ نئی سمت نیا مکالمہ'' کی ستائش کی۔

اس اجلاس میں مہمان خصوصی کے طور پر صحیفہ نگار جناب محی الدین پاشاہ (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب دکن) نے شرکت کی۔ پروفیسر محمد ہاشم علی، سید مجیب الرحمٰن، وہاب عندلیب، شریف احمد قریشی، احمد جاوید (نائب صدر) اور میر شاہ نواز شاہین (شریک معتمد) نے تخلیقات پر اظہار خیال کیا اور گلبرگہ سے دس سال تک متواتر تسلسل کے ساتھ روزنامہ انقلاب دکن کی اشاعت پر مبارکباد پیش کی۔ خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد انجمن) نے نظامت کے فرائض انجام دیے اور شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

## اردو، دوسری سرکاری زبان پر موثر عمل آوری کی ہدایت

● حیدر آباد، 22 نومبر۔ ریاستی حکومت نے آندھرا پردیش کے 13 اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے موثر عمل آوری کو یقینی بنانے کے لیے سرکاری حکم نامہ جاری کرتے ہوئے تمام ضلع کلکٹروں کو ضروری ہدایات دی ہیں اور ریاستی سرکاری زبان کمیشن نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر نظم ونسق میں استعمال کرنے کے لیے موثر اقدامات کرنے کا تمام محکمہ جات بشمول ضلع کلکٹروں سے مطالبہ کیا ہے۔ جناب اے بی کے پرساد صدر نشیں سرکاری زبان کمیشن نے بتایا کہ ریاستی سطح پر تلگو اور اردو میڈیم ذریعۂ تعلیم سے نمایاں مقام حاصل کرنے والے طلبہ کو ترغیبات دینے کا ریاستی سرکاری زبان کمیشن نے فیصلہ کیا ہے اور ان ترغیبات کے لیے دسویں جماعت سے اعلیٰ تعلیم کی سطح تک ہر سطح سے کم از کم پانچ پانچ طلبہ کا انتخاب کر کے انھیں نقد رقم اور توصیلی اسناد عطا کرنے کے لیے سرکاری زبان کمیشن نے قرارداد منظور کی ہے تاکہ تلگو اور اردو زبان کو فروغ دیتے ہوئے اس کی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

(سیاست، حیدر آباد)

## یاد فضل تابش

● بھوپال، 23 نومبر۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے سابق سکریٹری اور اردو کے مشہور ادیب وشاعر فضل تابش مرحوم کی یاد میں ایک جلسہ بھارت بھون میں منعقد کیا گیا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے سید آفاق علی نے کہا کہ شاعری، ڈراما اور ناول میں اپنی موجودگی درج کرانے والے فضل تابش بھوپال کی نرالی تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ انھیں ان کے جاننے والے تعلقات وروابط کا کشادہ مرکز کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ ایسا مرکز جس میں دوست، دشمن، اپنے، پرائے اور ہندی اور اردو کے خانوں میں بٹے ہوئے لوگ بھی اپنائیت محسوس کیا کرتے تھے۔ ''اکھاڑے کے باہر''، ''ڈرا ہوا آدمی'' (ڈراما)، ''اردو ہے جس کا نام'' (ڈراما)، ''وہ آدمی'' (ناول) ان کی اہم تخلیقات ہیں۔ انھوں نے مشہور فلم سازوں اور ہدایت کاروں منی کول، کمار ساہنی اور اسماعیل مرچنٹ کی فلموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے تھے۔

'تت بندیلہ' تنظیم کی طرف سے منعقد اس پروگرام میں کوی اور ڈراما نگار راجیش جوشی، ادیب منوہر ورما اور ڈراما ہدایت کار ننجے مہتا نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (عالمی سہارا، نئی دہلی)

## اردو فاؤنڈیشن کا جلسہ

● نوئیڈا، 21 نومبر۔ صبا اپارٹمنٹ سیکٹر 24 میں اردو، ہندی ادیبوں اور شاعروں کا ایک جلسہ اردو فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقد کیا گیا جس میں محترمہ کِکی ورمانے ''ہماری مشترکہ تہذیب: ادب کے حوالے سے''، ایک مقالہ پڑھا۔ شبانہ نذیر، گلزار دہلوی اور رفعت سروش نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے تو خمیر میں ہی مشترکہ تہذیب ہے۔ جلسے کی صدارت جرمنی سے آئے ہوئے مشہور دانشور محمد اسد اللہ نے کی۔ ان کی تازہ کتاب ''ہم رنگ خطوط'' پر رفعت سروش نے ایک مختصر مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، سبط حسن، پروین شاکر اور کیفی اعظمی جیسے ادبا وشعرا پر کام کرنے کے لیے ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ شیخ سلیم احمد نے راجندر سنگھ بیدی کی کہانی ''گرہن'' پر ایک مختصر مضمون پڑھا۔ بعد ازاں کمال احمد صدیقی، مظہر امام، گلزار دہلوی، راجیش شکل بچن اور پروفیسر کرشن چندر کھیمکا اور رفعت سروش نے اپنا کلام سنایا۔

(ڈاک سے)

## عربی زبان کی نشو ونما پر تربیتی ورکشاپ

● نئی دہلی۔ تنظیم برائے فروغ اسلامی علوم وثقافت (ISESCO) کی دعوت اور العربیہ مجمع (Arabic for All) کے اشتراک وتعاون سے اسلامک فقہ اکادمی انڈیا کی طرف سے عربی زبان کی نئی تعلیمی تکنیک پر چھ روزہ تربیتی ورکشاپ کا آغاز 19 نومبر کو جامعہ ہمدرد دہلی میں کیا گیا، جس کے افتتاحی اجلاس میں عربی زبان کی تدریس وتعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اسکالر، علما، نامور سیاسی قائدین، مختلف ممالک کے سفارتخانوں کے نمائندے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اساتذہ نے شرکت کی۔ شرکا میں راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیئرمین کے. رحمٰن خاں، ہمدرد یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمیم احمد، پروفیسر اجتبیٰ ندوی، مولانا عبید اللہ اسعدی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، ڈاکٹر عبدالماجد قاضی، ڈاکٹر شفیق احمد خاں ندوی، ڈاکٹر ایوب تاج الدین ندوی اور مولانا عتیق احمد بستوی کے نام شامل ہیں۔ پروگرام کی صدارت سعودی عرب کی معروف تنظیم ''العربیہ مجمع'' کے نمائندے ڈاکٹر محمد بن شدید البشری نے کی۔ افتتاح کے. رحمٰن خاں نے کیا۔ انھوں نے جدید وسائل اور میڈیا کے ذریعے عربی زبان وادب کی خدمات پر زور دیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

## اعزازات وانعامات

### کرناٹک اردو اکادمی انعامات

● بنگلور، 2 دسمبر۔ کرناٹک کے وزیر اعلیٰ این. دھرم سنگھ نے ریاست کے اہل اردو کے ایک دیرینہ مطالبے کو قبول کرتے ہوئے بنگلور کے طرٹینک روڈ میں ایوان اردو کی عمارت تعمیر کرانے کا اعلان کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں

بنگلور ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے کمشنر کو ہدایات جاری کی جاچکی ہیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کی تقریب تفویض اعزازات اور انعامات برائے کتب سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ نئی نسل اردو سے بے بہرہ ہوتی جارہی ہے۔ اسے اردو کی شیرینی، نفاست اور اس کے حسن سے واقف کرانے اور اس سے رشتہ جوڑے رکھنے کے لیے اردو اکادمی کو خصوصی پروگرام کرنے چاہئیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی تجویز کی عمل آوری کے لیے جس قدر بھی فنڈ طلب کرے گی، میری حکومت اسے دینے کے لیے تیار ہے، وزیراعلیٰ نے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور مخدوم محی الدین جیسے شعرا کے قریبی دوست رہ چکے ہیں، شستہ اردو میں تقریر کی۔ اپنی خیرمقدمی تقریر میں صدر اکادمی پروفیسر م.ن. سعید نے وزیراعلیٰ کا شکریہ ادا کیا۔

وزیراعلیٰ کے بدست سال 2004 کے اعزازات درج ذیل ممتاز شخصیتوں کو پیش کیے گئے جن میں پہلی بار ایک خاتون ادیب شامل ہیں۔ محترمہ حنا روحی برائے نثری خدمات، جناب جبار جمیل برائے شعری خدمات، جناب صدیق آلدوری برائے صحافتی خدمات، جناب عبدالقدیر برائے تعلیمی خدمات اور جناب اکرام کاوش برائے مجموعی خدمات۔

اس تقریب میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے چانسلر پروفیسر عبید صدیقی نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اردو اکادمی اگر ادبی کتابوں کی ایک اچھی لائبریری قائم کرے تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔ آپ نے درج ذیل مصنفین کو ان کی کتابوں پر انعامات پیش کیے۔

سامانِ سفر تازہ کریں از میر فیاض علی قریشی، گمشدہ موجودگی از ڈاکٹر انور مینائی اور آئینہ در آئینہ از ڈاکٹر جاوید رفاعی۔ اس موقعے پر ڈپارٹمنٹ آف کنڑا اینڈ کلچر حکومتِ کرناٹک کی پرنسپل سکریٹری محترمہ اوشا گنیش (آئی اے ایس) اور ڈائرکٹر شری مدو موہن بھی شریک تھے۔ رکن اکادمی محمد اعظم شاہد اور محترمہ صبیحہ زبیر نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ (ڈاک سے)

## غالب انعامات برائے 2005

● نئی دہلی، 22 نومبر۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالب انعام سب کمیٹی کی میٹنگ پروفیسر سید امیر حسن عابدی کی صدارت میں ہوئی جس میں مندرجۂ ذیل دانشوروں کو غالب انعامات برائے سال 2005 منتخب کیا گیا۔

فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے اردو تنقید و تحقیق۔ پروفیسر فضیل جعفری (ممبئی)، فخرالدین علی احمد غالب انعام برائے فارسی تنقید و تحقیق۔ پروفیسر عبدالودود اظہر (دہلی)، غالب انعام برائے اردو شاعری۔ جناب اختر سعید خاں (بھوپال)، غالب انعام برائے اردو نثر۔ جناب عابد سہیل (لکھنؤ)، ہم سب غالب انعام برائے اردو ڈراما۔ جناب یوگراج ٹنڈن (دہلی)، غالب انعام برائے مجموعی ادبی خدمات۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی (دہلی) اور غالب انعام برائے علمی خدمات (سائنس)۔ ڈاکٹر محمد اسلم پرویز۔ (ڈاک سے)

## مختصرات

● بارہ بنکی، 10 نومبر۔ علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم ولادت کے موقعے پر رابطہ سیوا سنستھان کی طرف سے ہوٹل مغل دربار میں منعقد تقریب کی مہمان خصوصی چپیل نسواں ڈگری کالج بارہ بنکی کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر صفت الزہرہ زیدی تھیں۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر تسخیر الحسن نے کی اور افتتاح ضلع اقلیتی بہبود افسر راجا سنگھ نے کیا۔ رابطہ سیوا سنستھان کے کوآرڈینیٹر جناب محمد سلیم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈپلوما ان اردو لینگویج کورس کے طلبہ و طالبات کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی زندگی میں اردو کو اس طرح اتار لیں کہ پہلے جلسے میں ہی انھیں اردو داں تسلیم کرلیا جائے۔

ارم گرلس ڈگری کالج چوک لکھنؤ کے پرنسپل جلیل یار خاں وارثی نے اپنے صدارتی خطبے میں اسناد حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو مبارک باد دی۔ علامہ اقبال اور آزاد کو یاد کرتے ہوئے جناب وارثی نے کہا کہ یہ دونوں قومی یکجہتی کی بہترین مثال ہیں۔ جلسے میں محترمہ ناہید پروین، ڈسٹرکٹ کوآرڈینیٹر یونیسیف خورشید احمد خاں، پرنسپل عظیم الدین اشرف اسلامیہ انٹر کالج، عابد نظر، ڈاکٹر ایس ایم حیدر، اور محمد مستقیم انصاری نے بھی خطاب کیا۔ تنظیم کے صدر جناب فرحت علی نے اظہار تشکر کیا۔ (ڈاک سے)

● گلبرگہ، 26 نومبر۔ محمد شوکت منیجنگ پارٹنر ایکسیل ٹیکنالوجی ایوانِ شاہی، گلبرگہ نے انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر کے طلبہ میں ویژول بیسک سے دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ویژول بیسک پروگرامنگ کے عنوان سے توسیعی خطبہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ پروگرامنگ ڈیولپمنٹ میں ویژول بیسک کا مقام سب سے اعلیٰ ہے اس لیے کہ 60% سے 80% سافٹ ویئر ڈیولپمنٹ میں ویژول بیسک ہی استعمال ہورہا ہے۔ یہ اس لیے بھی مقبول ہے کہ یہ کوڈنگ، ڈیزائننگ، ڈیٹا بیس سپورٹ، انٹرنیٹ پراپلی کیشن اپ لوڈ کرنے میں بڑی سہولت فراہم کرتا ہے اور اس کے استعمال سے کچھ ہی دنوں میں بڑے سے بڑا سافٹ ویئر تیار کیا جاسکتا ہے۔ قبل ازیں محمد ظہیر احمد خاں سینٹر سپر وائزر نے مہمان کا تعارف کرایا اور باسط نگار نے توسیعی خطبے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ محترمہ نازیہ بیگم نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

● سنبھل، 20 نومبر۔ ''عصر جدید کے نظم گو شعرا میں فیض احمد فیض کی

شخصیت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور ان کی شاعری نہ صرف قدیم و جدید کا سنگم ہے بلکہ احساسات، حادثات اور واردات زندگی کا آئینہ ہے۔" ان خیالات کا اظہار حسین افسر نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ فیض کی شاعری انقلابی شاعری ہے جو زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہے۔ محترم نسیم فاطمہ نے کہا کہ فیض کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی تاہم ان کو مقبولیت اور شہرت نظم گوئی سے ملی۔ انھوں نے کہا کہ فیض کی نظموں کی کامیابی اور مقبولیت کا راز صداقت ہے۔ اس موقعے پر انجینئر محمد فرقان، محمد فیضان، رضی انور، سبحان عادل، خورشید احمد، رفاقت حسین، شہزاد احمد، تنزیل احمد وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ نظامت محمد سعود نے کی۔

(عالمی سہارا، نئی دہلی)

● گلبرگہ، 20 نومبر۔ حلیمہ ایجوکیشنل اینڈ چیریٹیبل ٹرسٹ، گلبرگہ کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جارہے دو سالہ فنکشنل عربک ڈپلوما اور ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس کے طلبہ و طالبات کی ادبی و ثقافتی انجمن کا ایک ادبی اجلاس کمپیوٹر سینٹر بلال آباد، گلبرگہ میں منعقد ہوا۔ فن اور فنکار کے تحت معروف شاعر اکرم نقاش کے شعری مجموعے "شعر" کا جائزہ لیا گیا۔ صدر جلسہ افسانہ نگار امجد جاوید نے کہا کہ اکرم نقاش کی شاعری میں نہ صرف غیر معمولی بے ساختگی ہے بلکہ ان کی شاعری میں جو پیکر ابھرتے ہیں ان سے ان کی شعری صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جلسے میں محب کوثر، اکرم نقاش، ناظم خلیلی اور لطفی شیریں نے اظہار خیال کیا۔ سید سمیع اللہ حسینی سینئر سپروائزر نے ادارے کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور اس کی جامع رپورٹ پیش کی جبکہ سید علیم اللہ حسینی لکچرر نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور طالب علم جاوید انصاری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ادارے کے طالب علم محمد بن عمر نے جلسے کی کاروائی چلائی۔ (ڈاک سے)

● راورکیلا، 9 نومبر۔ آنند بھون لائن میں واقع نواب گیرج میں ڈاکٹر علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو آل اڑیسہ فروغ اردو کونسل کی جانب سے یوم اردو کے طور پر منایا گیا۔ اس موقعے پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں اڑیسہ اردو اکادمی، بھونیشور کے سکریٹری ڈاکٹر لیاقت علی مہمان خصوصی اور مقامی ایم ایل اے جناب شاردا نائک بطور اعزازی مہمان شریک ہوئے۔ مشاعرے میں منجو کماری عشرت، انجم اظہر، اجے کمار پنڈا عالم، گھائل فریدی، حاجی حبیب الرحمٰن حبیب، شیام سومانی، نسرین بانو نکہت، ثاقب جمیل، قیصر جاوید، اور قربان انصاری نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت حبیب الرحمٰن نے کی۔ مشاعرے کے انعقاد میں عبدالاحد، رشید اسلم، محمد انور، حاجی طیب قریشی، حسین خاں، محمد عمران رحمانی، اقبال قریشی، شہاب الدین، الطاف شکیل، قدوس جاوید، محمد وسیم، محمد سلام وغیرہ کا اہم کردار رہا۔ (ڈاک سے)

● گیا۔ انجمن ترقی اردو، ضلع گیا کی جانب سے 27 نومبر کو گیا کے مخدوم محی الدین ہال میں منعقدہ ایک جلسے میں اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے جناب فرحت قادری کو سریر کابری ایوارڈ، ناوک حمزہ پوری کو شفق عماد پوری ایوارڈ، پروفیسر تاج انور کو انجم مانپوری ایوارڈ، جناب ایم ایس راہی کو شمر نگاروی ایوارڈ اور جناب سید عبدالمعین کو سید وکالت حسین ایوارڈ دیا گیا۔ (ڈاک سے)

● ممبئی، 17 نومبر۔ ہندوستانی پرچار سبھا کی طرف سے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر اور لائبریری کے بہ اشتراک پ.ل. دیش پانڈے کے مراٹھی خاکوں کے ترجمے "عکس" (مترجم: محمد حسین پرکار) کا اجرا ہندوستانی پرچار سبھا کے اعزازی سکریٹری سبھاش سمپت نے کیا۔ جلسے کی صدارت ہندوستانی پرچار سبھا کے اعزازی خازن پرنسپل پریمانند گوونکر نے کی۔ ڈاکٹر چندر کانت باندوڈیکر اور ڈاکٹر کیشو مشیرام نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔

(ڈاک سے)

● علی گڑھ، 15 نومبر۔ ابن سینا اکادمی میں زیر صدارت جناب نواب بہادر رحمت اللہ خاں شیروانی "مرقع کالج" کے اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ کتاب کے مصنف مولوی بدرالدین ہائی کورٹ وکیل ہیں۔ اس کی طباعت و اشاعت، تزئین و ترتیب جناب قاسم صدیقی، سابق ریڈر شعبۂ تعلیمات نے کی ہے۔ کتاب کا مقدمہ پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی نے تحریر کیا ہے۔ جلسے میں اظہار خیال مشہور دانش ور پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر مختارالدین آرزو اور پروفیسر افتخار عالم خاں نے کیا۔ یہ جلسہ ابن سینا اکادمی کے ڈائرکٹر پروفیسر ظل الرحمٰن اور جناب م.ندیم کی کوششوں سے منعقد ہوا۔ (ڈاک سے)

● کڈپہ، 18 نومبر۔ کمال صاحب اسمارک ہندی بھون اور شاردا ہندی ودیالیہ رویندر نگر، کڈپہ کی جانب سے "ہندی دیوس سماروہ اور ہندی اردو مشاعرہ منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت رحمت اللہ سی سری نے کی اور مہمان خصوصی اشوک کمار کلکٹر کڈپہ تھے۔ اس جلسے میں ڈاکٹر دی نارائنن، ڈاکٹر دلیپ سنگھ رجسٹرار ہندی پرچار سبھا، مدراس، کے. پی. ابراہیم خاں، ڈاکٹر وائی بالاسوری ریڈی، صدر ہندی ساہتیہ سمیلن نے تقریریں کیں۔ مشاعرے میں ساغر جیدی، سی سری، ن.م. جالب، ستار فیضی، رہانی یونس، طیب، شکیل، منیر وغیرہ نے کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● دوربھ کے معروف شاعر و ادیب رفیق شاکر کی تصنیف "شمع فروزاں" کا اجرا ملت ایجوکیشنل ویلفیئر اینڈ کلچرل ایجوکیشن، باری ٹاکلی کی جانب سے قاضی رؤف انجم کی صدارت میں منعقدہ جلسے میں معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر محبوب راہی نے کیا۔ اس موقعے پر فراز عارف اکولوی اور خالد انور نے کتاب سے متعلق اظہار خیال کیا۔ پروگرام کی نظامت خالد انور نے کی۔ (ڈاک سے)

رسم اجرا

## اگلی عید سے پہلے

● سرینگر۔ مشہور ادیب آنند لہر کے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' (جس پر نیلم ٹی وی پروڈکشن نے کا ڈی ڈی ون کاشری چینل کے لیے ٹی وی سیریل تیار کیا ہے) کا اجرا جموں وکشمیر کے گورنر جناب ایس کے سنہا کے ہاتھوں ہوا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر ظہور الدین نے کی۔ جناب ایس آر سدھیر ایڈیٹر ''نوائے ڈگر'' اور جموں یونیورسٹی کے پنجابی شعبے کے سربراہ پروفیسر دیوندر سنگھ مہمان خصوصی تھے۔ جناب ایس کے سنہا نے کہا کہ بھارت شروع سے ہی سیکولر ملک رہا ہے اور یہاں بلا امتیاز مذہب وملت، فرقہ، طبقہ اور علاقہ، ہر فرد کو یکساں حقوق حاصل ہیں اور ترقی کرنے کے مواقع فراہم کیے جا رہے ہیں۔

جناب سری رام سدھیر نے کہا کہ آنند لہر ایک ترقی پسند ادیب ہیں جو سماج کے ہر طبقے کی خوشحالی کے متمنی ہیں۔ سماجی نابرابری، انسانی حقوق کی محرومی، سماجی برائیوں اور ناانصافی کے خلاف آواز اٹھانا ان کی خصوصیت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو زبان کسی ایک طبقے یا فرقے کی نہیں بلکہ مشترکہ ہندوستانی کلچر کی نمائندہ ہے جس نے جنگِ آزادی میں نمایاں کردار نبھایا۔

پروفیسر دیوندر سنگھ نے کہا کہ آنند لہر کا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کشمیر کی روایات اور تہذیب وتمدن کو پیش کرتا ہے جو کہ کشمیریت کی بنیاد ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے بغیر کشمیر مکمل نہیں ہوسکتا، یہ اس ناول کا پیغام ہے جسے بڑی خوبی اور خوبصورتی سے لوگوں تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے کہا کہ آنند لہر دورِ حاضر کا ایک معتبر اور نامور ادیب ہے۔

(ڈاک سے)

## جذبی شناسی

● پٹنہ، یکم دسمبر۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کی جانب سے ممتاز ترقی پسند شاعر اور ناقد معین احسن جذبی کی شخصیت اور شاعری پر منعقدہ دو روزہ قومی سیمینار میں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو میں استاد ڈاکٹر مشتاق صدف کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''جذبی شناسی'' کا اجرا لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر امتیاز احمد اور پروفیسر مجاہد حسین حسینی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر امتیاز احمد نے کہا کہ ''جذبی شناسی'' جذبی کی تفہیم کے لیے بہت ہی عمدہ اور معیاری کتاب ہے اور جذبی کی شاعری کے حوالے سے یہ پہلا کام بھی ہے۔ پروفیسر مجاہد حسین حسینی نے کہا کہ یہ تصنیف جذبی کی شاعرانہ فنکاری کو پوری طرح واضح کرتی ہے۔ ڈاکٹر مشتاق صدف نے خدا بخش لائبریری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے اپنے لیے ایک یادگار دن قرار دیا۔ اس موقعے پر شفیع مشہدی، شکیب ایاز، پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر ایم آر قاسمی، عالم خورشید، سلطان اختر، اعجاز علی ارشد، شیم فاروقی اور کئی دیگر اہم شخصیات موجود تھیں۔

(ڈاک سے)


احمقوں کی جنت

**مصنف: ششنکر/ مترجم: ڈاکٹر شریف احمد**

''احمقوں کی جنت'' میں بچوں کے لیے 12 چھوٹی چھوٹی مزیدار اور سبق آموز کہانیاں ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے بچے اپنی ہنسی روک نہیں سکتے۔

ہر کہانی کے ساتھ کارٹونی تصویر بھی دی گئی ہے۔

**صفحات: 24، قیمت: -/12 روپے**

ربن

**مصنف: سوکمار ششنکر/ مترجم: کے. پی. رائے زادہ**

بچوں کو اپنے کھلونے، میک اپ اور کھیل کود سے بڑی دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان موضوعات پر خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے ہیں۔ انھی سامانِ تفریح میں ایک ''ربن'' ہے جو مالا کی سالگرہ پر اس کی ماں دیتی ہے۔ یہ ''ربن'' کس کس طریقے سے اس تک پہنچتی ہے کہانی میں اس کا پُرتجسس بیان بچوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

**صفحات: 16، قیمت -/15 روپے**

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

# تبصرہ وتعارف

## غزل اورغزل کی تعلیم/ اختر انصاری

صفحات: 231، قیمت:-/66روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

مبصر: رئیس احمد

اختر انصاری کی یہ کتاب درس وتدریس سے وابستہ افراد کے لیے بطور خاص صنف غزل کی تعلیم سے متعلق بڑی کارآمد اور مفید مطلب ہے۔ اس کتاب کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ صاحب کتاب نے غزل کی تعلیم کے دوران پیش آنے والے مسائل کو گہرائی سے محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ بڑی باریک بینی سے اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں ان کے حل کی جانب بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے، علاوہ ازیں اردو غزل کے تاریخی و ادبی پس منظر اور غزل کے تعلیمی نقطۂ نظر پر سیر حاصل بحث کی ہے، اس اعتبار سے ''غزل اور غزل کی تعلیم'' اپنے موضوع اور مواد کے پیش نظر ایک مکمل اور جامع کتاب ہے۔ زیر تبصرہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں مصنف نے ''زبان و ادب کی تعلیم میں مقاصد وغایات کے مسائل'' کے تحت سادہ اور سلیس طرز بیان میں اپنے افکار ونظریات کو بصراحت بیان کیا ہے اور اس بحث میں مادری زبان کی اہمیت وافادیت کو واضح کیا ہے۔ بحث کا اختتام ماہر تعلیم ڈبلیو۔ ایم۔ رائبرن (W.M.Ryburn) کے ان الفاظ پر ہوا ہے— ''وہ تمام پسندیدہ اوصاف جو ایک اچھے شہری میں ہونے چاہئیں سلجھا ہوا دماغ، واضح اور شفاف اظہار، خلوص فکر، خلوص جذبات، خلوص عمل، جذباتی وتخلیقی صلاحیتوں کا عمل،—— ان تمام اوصاف کی حسب خواہش نشو ونما صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ مادری زبان کو جو انسان کی ذہنی وجذباتی زندگی کی اساس و بنیاد ہے، بہترین توجہ کا مستحق خیال کیا جائے۔''

دوسرے باب میں ''اردو غزل کے تاریخی اور ادبی پس منظر'' پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو غزل کی ہیئت ومقبولیت اور اس کے فنی و امتیازی اوصاف و محاسن اور غزل کی تنقید کے علاوہ اس کے بتدریج ارتقائی سفر پر بھی طائرانہ نگاہ ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب کا موضوع ''غزل اور تعلیمی نقطۂ نظر'' ہے۔ جس میں صاحب کتاب نے اردو نصابات میں غزلوں کی شمولیت سے متعلق چند اصول وضع کیے ہیں جن کے تناظر میں سادہ اور سلیس اشعار کو ہی شامل انتخاب کیا جاسکے گا، اس کے برعکس زیادہ فلسفیانہ، داخلی یا عالمانہ اور فحش کلام کو شامل انتخاب کے ذیل میں یکسر نظر انداز کیا جاسکے گا۔

چوتھے باب میں ''غزل اور مدرس'' کے تعلق سے اظہار خیال کیا گیا ہے جس میں مصنف نے کہا ہے کہ ''اردو غزل کے استاد کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ غزل اور اس کے تمام پہلوؤں سے مکمل اور بھرپور واقفیت بہم پہنچائے جس کے بغیر وہ اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برآ ہو ہی نہیں سکتا''۔ بعد ازاں اردو غزل کی ہیئت، موضوعات، اسالیب اور علامتی اظہار کے علاوہ غزل کی تنقید جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

''غزل کی تدریس اور تدریسی طریق کار کے مسائل'' کتاب کا پانچواں باب ہے جس میں اختر انصاری نے تدریسی طریق کار کے مسائل اور عمل تدریس سے متعلق گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ ''ایک ذمے دار اور فرض شناس استاد کو ہر سبق سے پہلے ذہنی تیاری کی حسب ذیل منزلوں سے گزرنا ضروری ہے۔

1. پڑھائے جانے والے سبق کے موضوع، اس کی تفصیلات اور جملہ متعلقات سے مکمل واقفیت۔
2. ذہنی سطح پر مقاصد سبق کی تشکیل۔
3. معینہ مقاصد کی روشنی میں سبق کے متن ومواد کا انتخاب۔
4. منتخبہ مواد کی اجزائی تقسیم۔
5. تدریسی طریق کار کے بارے میں ضروری فیصلے۔
6. امدادی وسائل کے بارے میں فیصلہ۔
7. سبق کے مختلف مدارج (تمہید سبق، متن سبق اور اعادہ واطلاق)''

آخر میں ذیلی عنوانات کے تحت غزل کے سبق کی افادیت بیان کی گئی ہے جن میں ''غزل ایک فکری وحدت''، ''غزل کے سبق میں تمہید سبق کی منزل''، ''غزل کے سبق میں متن سبق کی منزل''، ''غزل کے سبق میں اعادۂ سبق کی منزل'' اور ''غزل کی تعلیم میں ادبی حسن شناسی اور لطف اندوزی'' جیسے موضوعات شامل ہیں۔

'غزل کی تعلیم میں علامتی اظہار کا مسئلہ' کتاب کا چھٹا باب ہے، جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ ''غزل کی تعلیم میں جو چیز سب سے زیادہ توجہ اور غور وفکر کا مطالبہ کرتی ہے وہ غزل کی ایمائیت ہے اور غزل کے علائم و رموز کی اہمیت و معنویت کو متعلمین کے ذوق وفہم کی حدود میں لانا استاد کے لیے سب سے مشکل کام ہے۔ استاد کو طلبہ کو یہ بتانا لازمی ہے کہ غزل میں کوئی بھی بات براہ راست نہیں کہی جاتی بلکہ اشارات وتمثیلات کے ذریعے کہی جاتی ہے اور اس خصوص

میں غزل تمام دیگر اصناف سے مختلف و ممتاز ہے''۔ اس کے علاوہ اس باب میں اردو غزل کے علامتی نظام کو اساتذہ کے کلام کے تناظر میں مع امثال واضح کیا گیا ہے۔ درس و تدریس کے تعلق سے کتاب کا ساتواں باب بڑی اہمیت کا حامل ہے اس میں بطور نمونہ پانچ عدد منصوبہ ہائے سبق پیش کیے گئے ہیں جو مرزا غالب، میر تقی میر، خواجہ الطاف حسین حالی اور امیر مینائی کے شعری کلام پر مبنی ہیں۔ یہ اسباق اساتذۂ کرام اور زیر تربیت اساتذہ کی رہنمائی کے لیے عمدہ نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ان شعری اسباق کی تدریس میں مقاصدِ سبق، تمہیدِ سبق، اظہارِ مقصد، متنِ سبق، سوالات و مباحث اور اعادہ سبق کی افادیت و معنویت کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔

کتاب کا آخری باب'' انتخاب غزل (تعلیم و تدریس کے نقطۂ نظر سے)'' دراصل کتاب کے تیسرے باب (غزل اور تعلیمی نقطۂ نظر) کی توسیع ہے جس میں تعلیمی نقطۂ نظر کی روشنی میں اساتذۂ کرام مثلاً میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، انشاء اللہ خاں انشا، خواجہ حیدر علی آتش، مرزا اسد اللہ خاں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق، مومن خاں مومن، میر ببر علی انیس، خواجہ الطاف حسین حالی، امیر مینائی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی، سیماب اکبر آبادی، حفیظ جالندھری اور محمد علی جوہر کی کل 89 غزلوں کا ایک انتخاب پیش کیا ہے، جو متعلمین کے لیے غزل کی تعلیم کے تعلق سے مدد و معاون ہے۔ ناشر اور مصنف اس معیاری اشاعت پر یکساں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

•

## فیودر دستوئیفسکی / ظ۔ انصاری

**صفحات: 184، قیمت: -/52 روپے**

**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066**

**مبصر: سراج نقوی**

زیر تبصرہ کتاب مشہور زمانہ روسی ناول نگار اور مفکر فیودر دستوئیفسکی کے حالات زندگی، اس کی تصنیفات اور اس کے سیاسی و سماجی نظریات کا احاطہ کرتی ہے۔ پیش لفظ کے بعد ظ۔ انصاری کا ''یعنی'' کے عنوان سے تحریر کردہ مقدمہ دستوئیفسکی کے بارے میں موصوف کے نظریات کا آئینہ دار ہے۔ ہر چند کہ دستوئیفسکی نہ صرف اپنے دور کے روسی مصنفوں بلکہ عالمی ادب کے قلم کاروں میں بھی ممتاز مقام کا مالک ہے، اس کی تحریریں یقینی طور پر اپنی مقبولیت اور اہمیت کے اعتبار سے زماں و مکاں کی قید سے آزاد ہیں، لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مصنف نے دستوئیفسکی کے بارے میں مقدمے کے آخر میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے صرف اشتراکی نظریات کا قاری ہی متفق ہو سکتا ہے۔ ظ۔ انصاری لکھتے ہیں ''گاندھی، اربندگھوش اور اقبال کی تعلیمات اور تحریکوں کو کھرل کرکے اگر چھان لیا جائے تو بلا مبالغہ اس کا نچوڑ دستوئیفسکی ہوگا۔'' بہرحال ظ۔ انصاری کی اس مبالغہ آرائی کے باوجود دستوئیفسکی کی عظمت سے انکار ممکن نہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ دستوئیفسکی نے اپنے اور اپنے بعد کے عہد کے بے شمار ادیبوں، دانشوروں اور مفکرین کو اپنے نظریات اور فن سے متاثر کیا۔

''شروعات'' کے زیر عنوان دستوئیفسکی کی پیدائش، بچپن، لڑکپن اور نوجوانی کے حالات و کوائف بیان کیے گئے ہیں۔ ''مصنف دستوئیفسکی، کورے کاغذ سے کالے کاغذ تک'' عنوان کے تحت مصنف کے تخلیقی سفر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ''جرم و سزا'' ناول کی تصنیف، کے ذیلی عنوان کے تحت مذکورہ ناول کی تصنیف سے متعلق حالات و واقعات کا تذکرہ ہے جو دستوئیفسکی کی تخلیقات میں دلچسپی رکھنے والے قاری کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ ''تلاش، تخیل، تجربہ'' ذیلی عنوان کے تحت مصنف کے تخلیقی سفر پر اثر انداز ہونے والے بعض نفسیاتی پہلوؤں اور اس کے ذاتی تجربوں کا ذکر ہے۔ ''وسیع مطالعہ'' میں دستوئیفسکی کے شوق مطالعہ کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے اور ''طرز بیان'' میں مصنف کے انداز تحریر پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی اہم مصنفین اور ناقدین کی رائیں پیش کی گئی ہیں۔

پانچواں باب جو ''عشق...... نامراد اور بامراد'' کے عنوان سے ہے، کافی دلچسپ ہے۔ اس میں دستوئیفسکی کے عشق کی داستان اور عشق کے بارے میں دستوئیفسکی کے نظریات کو اسی کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ باب کی ابتدا دستوئیفسکی کے اپنے ہمراز بیرل ورینگل کو لکھے گئے ایک خط کے اس جملے سے ہوئی ہے۔ ''...... عشق لطف و انبساط بے پناہ، لیکن اس میں غم بھی اتنے ہولناک درپیش ہیں کہ عشق کی آگ سے ہمیشہ دامن بچائے رہنا ہی اچھا......'' اپنے بھائی میخائل کے نام ایک خط میں جو 1845 میں لکھا گیا دستوئیفسکی ایک شادی شدہ خاتون سے اپنے لگاؤ کا ذکر یوں کرتا ہے۔ ''...... کل پہلی بار میں پنائیف کے ہاں گیا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بیوی سے محبت میں مبتلا ہو کر آیا۔ اتنی ذہین، خوبصورت اور دلربا عورت ہے اور اوپر سے یہ کہ نہایت بے تکلف......'' چھٹا باب ''عورت اور دستوئیفسکی۔ اس کا ساتھی، سایہ اور تاثر'' کے عنوان سے ہے اور جیسا کہ اس کے عنوان سے ہی ظاہر ہے اس باب میں عورت کے بارے میں اس کے نظریات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جو عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے گئے۔ اس سلسلے میں کئی حوالوں کے بعد ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ ''دستوئیفسکی کے یہاں شروع کے 37-36 سال تک عورت بنی نوع انسان کے جبر اور مصائب کا مجسمہ ہے۔ مصنف اس کے صبر کی داد دیتا ہے، اس کے آگے احتراماً سر جھکاتا ہے اور صبر میں شریک ہوتا ہے۔ بعد کی عورت ایک پارہ جو کسی حال پر نہیں ٹھہرتا، حرارت سے

اڑتا ہے اور سرد مہری میں جتنا یا جمود میں مبتلا ہوتا ہے، شرارت اور سازش کا پیکر ہے۔ وفا اور بے وفائی کا مرکب ہے، شدید محبت اور شدید نفرت کا مجموعہ ہے اور ایسی تمنا کا مجسمہ جس کا کوئی اور چھور نہیں۔" ساتواں باب "گھر گرہستی" کے عنوان سے ہے اور دستوئیفسکی کی خانگی زندگی پر روشنی ڈالتا ہے اور ایک شوہر اور باپ کے طور پر اس کے کردار کو سامنے لاتا ہے۔" باقی کے دس سال" عنوان سے لکھا گیا باب مصنف کی زندگی کے آخری 10 برسوں کے حالات پر روشنی ڈالتا ہے۔ ایک باب "روسی دوستداروں کی انجمن" کے تاریخی اجلاس میں 8 جون 1880 کو پوشکن پر کی گئی دستوئیفسکی کی تقریر کے خلاصے پر مشتمل ہے اور آخری باب میں مصنف کی زندگی کی خاص خاص تاریخیں سلسلے وار دی گئی ہیں جو دستوئیفسکی کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر کتاب روسی ادب اور خصوصاً دستوئیفسکی کی شخصیت میں دلچسپی رکھنے والے ادب کے قاری اور طالب علموں کے لیے کافی مفید اور کارآمد ہے۔

•

## خواب مشین / سیر گھوش اور رچانسل
## مترجم: اقبال مہدی
**صفحات: 108، قیمت: -/24 روپے**
**ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6 آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066**
**مبصر: ایس. اے. رحمٰن**

آج کا دور سائنسی ترقیوں کا دور ہے۔ سائنسی ترقیوں سے زندگی آرام دہ اور مزیدار ہوگئی ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، تفریح اور معلومات کا ذریعہ ہیں تو واشنگ مشین، مکسر گرائنڈر وغیرہ روزمرہ زندگی میں مدد کرتے ہیں۔ سینما تفریح کا ذریعہ ہے تو ٹرین اور ہوائی جہاز سیر و سفر کا اور ان سب سے بڑھ کر کمپیوٹر کی ایجاد نے زندگی کو نئے رخ دیے ہیں۔ اس نے جہاں بہت ساری سہولتیں دی ہیں وہیں مسائل بھی سامنے آرہے ہیں۔ انٹرنیٹ، ویب سائٹ کمپیوٹر کے معلوماتی وسیلے ہیں تو ان وسیلوں کا غلط استعمال زندگی کو دو بھر بھی بنا رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کی شروعات اس طرح ہوتی ہے: "یہ کچھ بہت دنوں کی بات نہیں کہ ساری دنیا کے سائنسی حلقے میں لگاتار چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں نے ایک ہنگامہ مچا رکھا تھا...... سائنس کی دنیا میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اسی لیے سائنس داں اپنی قیمتی اور اہم تحقیقات کے تحفظ کے سلسلے میں کافی پریشان تھے۔"

خواب مشین ایک سائنسی ایجاد ہے ایک ہندوستانی کی، جو صرف خواب پڑھ سکتی ہے کسی کے خیالات کو سامنے نہیں لا سکتی۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جس میں انسانی نیند کے بارے میں بتایا گیا ہے اور نیند کے حوالے سے خواب کے مختلف مراحل کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔ عام طور پر نیند دو طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی قسم جلدی سے نہ گھومنے والی آنکھوں کی حرکت یعنی نان ریپڈ آئی موومنٹ ہے تو دوسری آنکھوں کی جلدی گھومنے والی حرکت یعنی ریپڈ آئی موومنٹ ہے۔ پہلی قسم کی نیند کے دوران آدمی سوچتا ہے اور دوسری قسم کی نیند کے دوران آدمی دیکھتا ہے یعنی یہ مرحلہ خواب کا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رائے چودھری کی خواب مشین کمپیوٹر جیسی ہے جس کے اسکرین بکھرے امیج یا عکس دکھا کر بتا سکتے ہیں کہ نیند زدہ شخص سوچ رہا ہے یا خواب دیکھ رہا ہے۔ اس سے متعلق عجیب و غریب عکس اسکرین پر ابھرتے اور غائب ہوتے رہتے ہیں۔ مصنفین نے ایک دلچسپ کہانی کی شکل میں ایک سائنسی تھیوری اور متوقع ایجاد کو پیش کیا ہے جو بچوں کے لیے تو دلچسپ ہے ہی لیکن عام قارئین بھی اس سے لطف اندوز ہوکر کچھ نئی سائنسی معلومات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ شروع میں چند سائنسی تحقیقات کی چوریوں کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اس خواب مشین کے ذریعے چوروں کا پتہ چلا لیا جاتا ہے۔ یہ مشین بچوں کی تعلیم و تربیت میں کام آسکتی ہے تو بڑوں کے لیے ان کی آرزوؤں کی تکمیل میں بھی مدد کر سکتی ہے۔ اگر خواب مشین، سچ مچ بن گئی تو کمپیوٹر کی طرح انسانی زندگی کا حصہ بن جائے گی چونکہ اس سے انسانی سوچ حقیقت کا جامہ پہنے گی تو چوری ڈکیتی کے معاملات کا تدارک ہوگا۔ اقبال مہدی کا ترجمہ رواں ہے اور قاری کو متاثر کرتا ہے۔ قومی اردو کونسل کی اس پیش کش کو اردو کے ادب اطفال میں ایک مفید اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

•

## کچھ سائنس سے / ڈاکٹر عبیدالرحمٰن
**صفحات: 236، قیمت: 150 روپے**
**ناشر: کتابستان، چندوارہ، مظفرپور، بہار**
**مبصر: فیروز عالم**

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس دور میں بھی ایسے قلم کاروں کی تعداد بہت کم ہے جو سائنسی موضوعات پر باقاعدگی سے لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبیدالرحمٰن ایک سائنسداں ہیں اور طویل عرصے سے اپنے مضامین کے ذریعے اردو قارئین کی معلومات میں اضافہ کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے مضامین کا انتخاب ہے جو وقتاً فوقتاً ماہنامہ "سائنس" دہلی اور سہ ماہی "سائنس کی دنیا" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول کا عنوان "علم کے مینار" اور باب دوم کا عنوان "علم کی تلاش" ہے۔ علم کے مینار کے تحت ان عظیم مسلمان سائنسدانوں اور مفکرین کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جنھوں نے جدید سائنس کی داغ بیل ڈالی اور جن کی نظری و علمی فکر کی بنیاد پر مغربی ممالک نے

سائنسی ترقی کی عمارت تعمیر کی۔ اس ضمن میں جابر بن حیان، الخوارزمی، الرازی، ابوالقاسم زہراوی، البیرونی، ابن الہیثم، ابن رشد، ابن بیطار کے علاوہ چند ہندوستانی سائنسدانوں مثلاً سی وی رمن، بیربل ساہنی، شانتی سروپ بھٹناگر اور سالم علی کی خدمات اور کارہائے نمایاں سے متعارف کرایا گیا ہے۔

باب اول کے پہلے ذیلی باب میں عظیم کیمیاداں اور طبیب جابر بن حیان سے متعارف کرایا گیا ہے۔ جابر بن حیان نے تیزاب پر کافی تحقیق کی اور ایک ایسا تیزاب تیار کیا جس میں سونا بھی گلایا جاسکتا تھا۔ انھوں نے لیموں اور سرکہ کے تیزاب کی دریافت بھی کی۔ دھاتوں کو صاف کرنے اور ان کے مرکبات تیار کرنے، لوہا بنانے اور اسے زنگ سے بچانے کے لیے وارنش کرنے، چمڑا رنگنے کے طریقے دریافت کرنے کے علاوہ جابر بن حیان نے بالوں کو رنگنے کے لیے خضاب تیار کرنے اور موم جامہ بنانے کی ترکیب بھی دریافت کی۔ انھوں نے بے شمار کتابیں لکھیں جن میں سے '' کتاب المیزان'' کو بے حد شہرت حاصل ہوئی۔

الخوارزمی کو ریاضی اور فلکیات پر دسترس حاصل تھی۔ حساب کی شاخوں الگوردم (Algorithm) اور الجبرا کے ساتھ ان کا نام خصوصیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ انھوں نے صفر کی اہمیت سے واقف کرایا۔ الجبرا میں منفی علامت (Negative sign) کی ایجاد بھی الخوارزمی نے ہی کی۔ ان کی تصنیف '' الجبرا والمقابلہ'' تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔

تیسرے ذیلی باب میں ابوبکر محمد بن زکریا رازی سے واقف کرایا گیا ہے جن کی تصنیف '' الجدری والحصبہ'' چیچک کے موضوع پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔ انھوں نے 1796 میں اس مرض کا ٹیکا ایجاد کیا تھا۔ ان کی تحقیق کی بنیاد پر ہی بعد کے دنوں میں اس موذی مرض کا خاتمہ ممکن ہو سکا۔ '' الحاوی'' اور '' المنصوری'' ان کی دیگر تصنیفات ہیں جن میں علم طب اور مختلف امراض اور ان کے علاج سے متعلق معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ طب کے علاوہ علم کیمیا اور علم طبیعیات میں بھی رازی کو خاصا دخل تھا۔ سلفیورک ایسڈ اور گنے کے رس سے الکحل سب سے پہلے رازی نے ہی تیار کیا۔ مختلف چیزوں کا مخصوص وزن (specific gravity) معلوم کرنے کے لیے انھوں نے فزیکل بیلنس نامی خاص ترازو استعمال کی جو آج بھی تجربہ گاہوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

چوتھے ضمنی باب میں ابوالقاسم زہراوی کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کا نام طبابت اور جراحت کے میدان میں بے حد اہم ہے۔ زہراوی نے بہت سارے آپریشن کیے اور ان کے لیے آلات بھی تیار کیے۔ ان کے تیار کردہ بہت سارے آلات آج بھی معمولی تبدیلی کے ساتھ مستعمل ہیں۔ زہراوی کی تصنیف "کتاب التعریف لمن عجز عن التالیف" کو طبی انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت حاصل ہے جس میں مختلف بیماریوں کے اسباب اور ان کے علاج پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

'' البیرونی: تاریخ کا روشن باب'' کے تحت ابوریحان محمد بن البیرونی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی تصنیف '' کتاب الہند'' قدیم ہندوستان کی تہذیب وثقافت سے متعلق بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ البیرونی نے دن اور رات، موسموں کی تبدیلی، سورج اور چاند کا بڑھنا گھٹنا، سورج گہن اور چاند گہن وغیرہ کی سائنسی وجوہات سے واقف کرایا۔ انھوں نے مثلثات، طبیعیات، علم الارض اور جغرافیہ میں کافی کام کیا۔ ریاضی کی شاخ کیلکولس کی ایجاد البیرونی نے ہی کی۔

ابن الہیثم کا نام ریاضی اور طبیعیات کے شعبے میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ریاضی سے متعلق 25 اور طبیعی علوم پر 44 کتابیں تصنیف کیں۔ وہ پہلے سائنسداں تھے جنھوں نے شعاعوں پر تحقیق کی اور اپنا نظریہ پیش کیا۔

ابن رشد کا شمار دنیا کے عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے فلسفہ اور منطق پر 28، طب پر 20، فقہ پر 8، علم ہیئت پر 4 اور علم نجوم پر 4 کتابیں لکھیں۔

ابن بیطار کی تصنیفات '' کتاب الادویۃ المفردہ'' اور '' مفردات ابن بیطار یا'' جامع الادویہ والاغذیہ'' کی اہمیت آج تک کم نہیں ہوئی۔ ان کتابوں میں انھوں نے پودوں کی بناوٹ، ان کی خصوصیات اور ان کے پھلوں کی خوبیوں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ دواسازی میں ان کے استعمال پر بھی بحث کی ہے۔ جڑی بوٹیوں سے تیار کی جانے والی دواؤں میں آج بھی ابن بیطار کے مشاہدات وتجربات سے استفادہ کیا جارہا ہے۔

اس باب میں ہندوستانی سائنسدانوں سی وی رمن، ماہر نباتیات بیربل ساہنی اور پرندوں کے ماہر سالم علی کی حیات وخدمات سے بھی واقف کرایا گیا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب علم کی تلاش میں مختلف سائنسی موضوعات پر مضامین پیش کیے گئے ہیں۔ '' زندگی کی کتاب'' میں انسانی زندگی کے آغاز وارتقا اور ڈی این اے کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ دیگر ذیلی ابواب '' کلوننگ: کہاں سے کہاں تک'' میں کلوننگ کی ابتدا، تکنیک اور اس کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ '' چاند کی چاہ'' میں چاند کے سفر اور چاند سے متعلق جانکاری دی گئی ہے، اس ضمن میں ہندوستان کی خلائی کامیابیاں بھی زیر بحث آئی ہیں۔ '' بارش کے بیج'' میں یہ بتایا گیا ہے کہ بارش کیسے ہوتی ہے اور اس میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ '' باسمتی کا اغوا'' میں باسمتی چاول کی تاریخ اور اس کے

پینٹ کیے جانے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ''مٹیالا سیب'' میں آلو کی تاریخ، اس سے متعلق تحقیق، اس کی مختلف اقسام اور دیگر باتوں سے واقف کرایا گیا ہے۔ ''دودھ کا دودھ پانی کا پانی'' میں دودھ کی اہمیت اور اس میں پائے جانے والے اہم عناصر سے روشناس کرایا گیا ہے۔ ستاروں کی موت، اوزون اور ہم، زلزلہ: کیوں اور کیسے؟، بھوک: ایک عالمی مسئلہ، بیج کی خودکشی، قدرتی ریشے، امراض جانور سے، پلیگ کی واپسی، ڈینگو کا حملہ، کیوں کہ سارس بھی ابھی بہت ہے......، کتنی پروٹین، باتیں کیڑوں کی، حیاتیاتی گھڑی، مٹی کا شیشہ، صفائی مچھلیاں، چائے اور صحت اور طشتری میں درخت اس کتاب کے دیگر مضامین ہیں جو بہت معلوماتی ہیں۔ امید کہ یہ کتاب اردو حلقے میں پسند کی جائے گی۔

•

## ''قاضی عبدالستار۔۔۔ فکر، فن اور فنکار''/ احمد خاں

**صفحات: 287، قیمت: 175 روپئے**
**ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی-110006**
**مبصر: احمد کفیل**

''قاضی عبدالستار۔۔۔ فکر، فن اور فنکار'' میں احمد خاں نے قاضی عبدالستار کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ اس سے قبل غیاث الدین کی کتاب ''آئینۂ ایام'' میں قاضی صاحب کے نمائندہ افسانوں کا تجزیہ، ناول ''دارا شکوہ'' پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا تجزیہ، ناول ''شب گزیدہ'' پر قرۃ العین حیدر کے تبصرے کے علاوہ دیگر حضرات کے قاضی صاحب سے متعلق چند مضامین اور انٹرویو شائع ہو چکے ہیں۔ اردو فکشن میں قاضی عبدالستار ایک بڑا نام ہے۔ اردو افسانے اور ناول کی دنیا میں انھوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔ انھیں صاحب اسلوب فکشن نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ شاعری سے کیا تھا لیکن ان کی افتادِ طبع نے انھیں فکشن کی طرف مائل کیا۔ ان کا پہلا افسانہ ''اندھا'' 1946 میں شائع ہوا تھا اور آخری ناول ''تاجم سلطان'' حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس لحاظ سے قاضی صاحب کی ادبی زندگی چھ دہائیوں پر محیط ہے۔

احمد خاں نے قاضی عبدالستار کی حیات اور خدمات کا مکمل جائزہ لینے کے لیے کتاب میں پانچ ابواب قائم کیے ہیں۔ مصنف نے ابتدائی صفحات میں ''اردو فکشن کے قاضی'' کے عنوان سے پیش لفظ لکھا ہے۔ اس کے بعد قاضی صاحب کی سوانح عمری قلمبند کی ہے۔ قاضی صاحب نے شاعری، تنقید اور تحقیق کے نادر نمونے بھی پیش کیے ہیں لیکن انھوں نے اردو فکشن میں اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ قاضی صاحب ایک جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب جاگیرداروں کی شان و شوکت زوال پذیر ہو رہی تھی لیکن ان کے جارحانہ تیور اب بھی باقی تھے۔ محنت کشوں کی پریشانی، انسانی قدروں کی پامالی، زمینداروں کے ظلم و ستم اور ان کے ٹوٹتے بکھرتے نظام کی توضیح مصنف نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کی ہے اور واضح کیا ہے کہ قاضی صاحب نے اپنے ان مشاہدات کو کس طرح فن کا لباس عطا کیا۔

قاضی صاحب نے اپنے ناولوں اور افسانوں کے اہم موضوعات تاریخی، سماجی، جنسی اور طبقاتی کشمکش سے اخذ کیے ہیں۔ مصنف نے ناول اور افسانے کو موضوعاتی سطح پر سماجی اور تاریخی دو بڑے خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سماجی و معاشرتی ناولوں میں ''دودِ چراغ محفل''، ''شب گزیدہ''، ''مجو بھیا''، ''بادل''، ''غبارِ شب''، ''حضرت جان'' اور ''تاجم سلطان'' اور تاریخی ناولوں میں ''صلاح الدین ایوبی''، ''دارا شکوہ''، ''غالب'' اور ''خالد بن ولید'' کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے جس میں تاریخی ترتیب کا بہ طور خاص لحاظ رکھا ہے۔ کتاب میں افسانہ نگاری اور منتخب افسانوں کے تجزیے کے لیے افسانوں کی تین موضوعاتی سطحیں قائم کی گئی ہیں۔ دیہی افسانے، شہری افسانے اور تاریخی افسانے۔ دیہی افسانوں میں ''پیتل کا گھنٹہ''، ''ٹھاکر دوارہ''، ''رضو باجی''، ''روپا''، ''مالکن'' اور ''مجری'' جیسے افسانوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شہری افسانوں میں ''ماڈل ٹاؤن''، ''ایک دن''، ''کتابیں''، ''سوچ'' اور ''تحریک'' جیسے افسانے اور تاریخی افسانوں میں ''آنکھیں''، ''بھولے بسرے'' اور ''نیا قانون'' وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ قاضی صاحب کے ناول اور افسانے کی تہذیبی دنیا بہت وسیع ہے۔ تاریخ، تہذیب، ماحول، سماج اور مختلف طبقات پر ان کا مطالعہ و مشاہدہ بہت گہرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جس طبقے اور جس ماحول کی تہذیب اور زبان کا نقشہ کھینچا ہے، ایک حقیقی دنیا آباد کی ہے۔ قاضی صاحب کے فن کے تجزیے کے بعد آخری باب میں موصوف نے ان کے اسلوب کا جائزہ لیا ہے۔ قاضی صاحب کے اسلوب بیان کو ناقدین ادب نے ''گرانڈ اسٹائل'' کا نام دیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں احمد خاں کا یہ دعوا بے جا نہیں کہ ''اردوئے معلی کی روایت کی رنگینی، تابناکی اور دلکشی بہت مشہور ہے لیکن اس دلکشی میں شعور و ادراک پر ہیبت اور احساس پر لرزہ طاری کر دینے والا اسلوب اردو فکشن کو قاضی صاحب کی دین ہے۔'' یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ احمد خاں کی یہ کاوش قارئین ادب میں خاطر خواہ پذیرائی حاصل کرے گی۔

•

مصنف: نیلما سنہا　　　"زمین کا آسیب اور دیگر کہانیاں" سے اقتباس　　　بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "زمین کا آسیب اور دیگر کہانیاں" سے اقتباس پیش کیا جارہا ہے۔ اس کتاب میں پندرہ کہانیاں پیش کی گئی ہیں جن میں سے چند کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں: زمین کا آسیب، حیرت انگیز پرندہ، زخمی بازو، خوشبو کی چوری، جنگلی بکری، درختوں کی جنگ، ہاتھی کا یتیم بچہ، جادوئی گیند وغیرہ۔ 127 صفحات پر مبنی اس کتاب کی قیمت صرف -/28 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

# پانی کی قدر

وہ گرمیوں کا ایک دن تھا۔ نیتا نے شاور کے نیچے کھڑے ہو کر نل کھول دیا۔ شاور سے پانی کی پھوار پڑنے لگی۔

"ہا" پانی کی پھوار گرتے ہی اس نے گہرا سانس لیا۔ گرمی نے اسے بے جان پژمردہ بنا دیا تھا اور وہ کافی تھکن محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک شاور کے نیچے آنکھیں بند کیے کھڑی رہی۔ فوارے سے نکلنے والی پانی کی بوندیں اس کے جسم کو بھگوتی رہیں۔

دیر تک نہاتے رہنے کا احساس اسے اس وقت ہوا جب اس کے چھوٹے بھائی بابو نے غسل خانے کے دروازے کو تھپتھپایا۔

"دیدی بہت دیر سے غسل خانے کے اندر ہے۔" بابو نے شکایت کرتے ہوئے کہا" وہ مجھے نہانے کا موقع نہیں دے رہی ہیں۔"

"نیتا جلدی کرو" اس کی ماں نے آواز لگائی۔

"آئی۔ ماں۔ بس ایک منٹ لگے گا۔" لیکن یہ ایک منٹ طویل ہوتا گیا۔ آخرکار پانچ منٹ بعد نل بند ہوا اور اسے باہر آنے میں مزید پانچ منٹ لگے۔ اس وقت وہ بالکل ترو تازہ دکھائی دے رہی تھی۔

"آخرکار نکل ہی آئیں" بابو نے کہا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ اس نے پوری رفتار سے شاور کا نل کھول دیا۔ نیتا نے دیکھا تھا کہ وہ اپنے کھلونے جو کشتیوں، جہازوں اور بطخوں پر مشتمل تھے غسل خانے کے اندر لے گیا تھا۔ اس نے المنیم کا ٹب نل کے نیچے رکھ کر اوپر تک بھر لیا۔ بابو اس ٹب کے اندر بیٹھ گیا اور تفریح کرنے لگا۔ کشتیاں اور جہاز ٹب میں تیرنے لگے۔ اس نے ٹب میں زبردست طوفان پیدا کیے اور شاور کی مدد سے بارش کی اس کی کشتیاں طوفان کی لپیٹ میں آگئیں اور طوفان سے جہازوں کو نقصان پہنچا۔ کبھی سیلاب آئے اور کبھی گہرے سمندر کا سماں پیش کیا گیا۔ یہ سب کچھ نل کے پانی کی مدد سے ہوا۔ نیتا اپنے گیلے بالوں میں کنگھا کر رہی تھی کہ کسی کا تار آیا۔

"اوہو" اس نے اپنی ماں کو کہتے ہوئے سنا "اماں بیمار ہیں اور انھوں نے مجھے فوراً بلایا ہے۔ ہمیں موتی پور جانے کے لیے پہلی گاڑی پکڑنی چاہیے۔"

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ موتی پور کے لیے روانہ ہو گئے۔ موتی پور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جہاں ان کی دادی رہتی تھیں۔ ریل گاڑی کے ذریعے وہاں جانے میں ایک دن لگتا تھا۔ نیتا اور بابو طویل عرصے کے بعد گاؤں جا رہے تھے۔ ان کے والدین اپنی ملازمت کے سلسلے میں شہر میں مصروف رہتے تھے۔ انھیں اتنا وقت ہی نہیں ملتا تھا کہ گاؤں جاتے۔

جس وقت یہ لوگ موتی پور پہنچے اندھیرا ہو چکا تھا۔ چاچا چاچی اور ان کی دو بیٹیوں شانتی اور موہنی نے گھر کے دروازے پر ان کا استقبال کیا۔ ''دادی کی حالت اب کافی بہتر ہے'' دونوں لڑکیوں نے انھیں بتایا۔ اس طرف سے اطمینان کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گئے۔

بول چال کی وجہ سے اچانک نیتا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہ سمجھی کہ شاید دادی کی حالت بگڑ گئی ہے۔

وہ بستر سے اتر کر پوچھنے لگی۔

''کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے؟ ماں کہاں ہیں۔'' اس کی آواز میں ہلکی سی خوف کی جھلک شامل تھی۔ نئی جگہ اسے ہر چیز عجیب سی لگ رہی تھی۔

اس سے پہلے وہ کبھی کچے مکان میں چھپر کے نیچے نہیں سوئی تھی۔

''بالکل خیریت ہے۔ ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔ تم سو جاؤ۔'' موہنی نے کہا

''یہ ڈر گئی ہے'' شانتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ شانتی نیتا کی ہم عمر تھی۔

''کیا یہ سمجھتی ہے کہ ہماری چھت میں سے سانپ بچھو گریں گے۔ یا شیر حملہ کردیں گے۔ یہ شہر کے لوگ بھی بس۔۔۔''

''شانتی چپ رہو'' موہنی نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا اور مہمان کی طرف مڑتے ہوئے بولی۔ نیتا۔ سو جاؤ۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہمیں جانا ہے اسی لیے ہم اٹھے ہیں۔''

''جانا ہے۔ کہاں''؟ نیتا نے حیرت سے پوچھا۔

''پانی لینے جانا ہے۔ یہ کام سورج نکلنے اور گرمی شروع ہونے سے پہلے کرنا ہے۔'' موہنی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن ابھی تو آدھی رات ہے۔'' نیتا حیرت سے بولی۔

اس کی اس بات پر قہقہہ پڑا۔ ''تڑکے کا وقت ہے اور یہ سمجھ رہی ہے کہ رات ہے۔ یقیناً یہ دوپہر تک سونے کی عادی معلوم ہوتی ہے۔'' شانتی نے حقارت آمیز انداز سے کہا۔

ان الفاظ پر برا مان کر نیتا اپنے بستر سے اتر آئی۔ ''میں دیر تک سونے کی عادی نہیں ہوں'' اس نے طیش میں آکر کہا ''اسکول بس پکڑنے کے لیے ہمیں بھی جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ کیا میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتی ہوں؟'' اس نے موہنی سے دریافت کیا۔

''یقیناً۔ اگر تم چاہو تو'' موہنی نے شفقت سے کہا۔ لیکن اس بات پر شانتی کا منہ بن گیا۔

''نہیں۔ نہیں۔ یہ جا کر کیا کرے گی۔ اس کے جانے سے ہمارے کام میں رکاوٹ پڑے گی۔''

اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اسے چلنے دو۔ یہ ماں والا برتن لے چلے گی کیوں کہ ماں تو آج مہمانوں کے سلسلے میں مصروفیت کی وجہ سے جا نہیں پائیں گی۔ ایک گھڑا زیادہ پانی آ جائے گا۔ لو یہ پکڑو نیتا'' موہنی نے اسے پانی لانے کے لیے پیتل کا ایک برتن پکڑا دیا۔

تینوں لڑکیاں روانہ ہو گئیں۔ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا اور دور افق پر روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ جھونپڑیوں کی قطار پیچھے رہ گئی۔

وہ کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی بٹیا پر برابر آگے بڑھتی رہیں۔ نیتا نے دیکھا کہ زمین خشک اور تڑخی ہوئی تھی۔ زمین پر جگہ جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں اور ہر چیز افسردہ اور زرد دکھائی دے رہی تھی۔

''اس سال ہمارے ہاں بارش نہیں ہوئی۔ موہنی نے اسے بتایا'' گاؤں کا کنواں بھی سوکھ گیا ہے۔ ہمیں پانی لینے کے لیے بہت دور جانا پڑتا ہے۔''

''کیا کوئی برساو غیرہ بھی نہیں ہے؟'' نیتا نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں۔ قریب میں ایک تالاب تھا۔ اس میں کچھ پانی بھی تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی سوکھ گیا اور کیچڑ کی شکل اختیار کر گیا۔ مچھلیاں مرنا شروع ہو گئیں۔ بچوں کے مزے آگئے۔ وہ خوب مچھلیاں پکڑتے اور بھون کر کھا جاتے۔ لیکن پھر مری ہوئی مچھلیاں سڑنے لگیں۔ تالاب میں ایک بوند بھی پانی نہیں بچا۔''

''تم پانی کہاں سے لاتی ہو؟'' نیتا نے پوچھا۔

''ہمارے گاؤں سے چار میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا چشمہ ہے۔ ہم وہیں سے پانی لاتے ہیں۔ کافی دور چلنے کی وجہ سے ہم تھک جاتے ہیں۔'' موہنی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ پانی تو لانا ہی ہوگا اور کوئی نہ کوئی تو لائے گا ہی۔''

نیتا تھکی نہیں تھی بلکہ وہ اس چہل قدمی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ ٹھنڈک اور کھلے میدان میں چلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اتنا بڑا میدانی علاقہ نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے چاروں طرف بڑی دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ سینکڑوں پرندے درختوں پر چہچہا رہے تھے یا زمین پر کود پھاند کرتے پھر رہے تھے۔

جلد ہی سورج بلند ہو گیا۔ اب جب وہ لوگ برگد اور آموں کے درختوں کے نیچے سے گزرتے تو ان کا سایہ خوش گوار محسوس ہوتا۔ رفتہ رفتہ گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔

''ابھی کتنی دور اور چلنا ہے؟'' نیتا نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں۔ کیا تھک گئیں'' شانتی نے مذاق اڑاتے ہوئے جملہ کسا۔

''مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم نہیں چل سکو گی۔''

''نہیں۔ میں تھکی نہیں ہوں'' نیتا نے ہنستے ہوئے کہا اور مزید تیز چلنے لگی۔ موہنی نے اس کی حالت کو محسوس کر لیا اور کہنے لگی۔ ''چلو تھوڑی دیر نیم کے اس درخت کے نیچے آرام کرتے ہیں۔'' تھوڑی دیر درخت کے سائے میں بیٹھنے کے بعد تینوں لڑکیوں نے اپنے اپنے برتن اٹھائے اور آگے چل پڑیں۔

پہاڑی علاقہ نظر آنے سے پہلے نیتا کو ایسا لگا گویا انھیں چلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ انھوں نے ایک پہاڑی پار کی اور نیچے وادی میں اتر گئیں جہاں چٹانیں اور پتھر بکھرے پڑے تھے۔

''ندی کہاں ہے؟'' اس نے چاروں طرف ان عورتوں اور لڑکیوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا جو اپنے بازوؤں میں پانی کے برتن دبائے ریتیلی زمین پر چل رہی تھیں۔

''یہ ہے ندی۔ پچھلی مرتبہ جب ہم آئے تھے تو زمین سے بہت تھوڑا سا پانی نکل رہا تھا۔ اب وہ بھی غائب ہو چکا ہے۔'' موہنی کی آواز

میں مایوسی تھی۔

نیتا ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور پسینہ پونچھنے لگی۔ عورتیں چاروں طرف پانی تلاش کر رہی تھیں۔ موہنی بھی ان کے ساتھ شامل ہوگئی۔

''مجھے پانی مل گیا ہے۔'' موہنی کی مسرت آمیز چیخ سن کر سب اس کی طرف دوڑ پڑے۔ چٹان کی ایک جانب سے تھوڑا تھوڑا پانی نکل رہا تھا۔ چٹان کے سائے کی وجہ سے پانی پوری طرح خشک ہونے سے بچ گیا تھا۔ اس دریافت سے نیتا بھی سرشار ہوگئی۔ وہ بھی دوڑ کر عورتوں کی بھیڑ میں شامل ہوگئی۔ پانی تک پہنچنے کے لیے عورتیں ایک دوسرے کو دھکیل رہی تھیں۔

''پہلے مجھے پانی بھرنے دو۔'' موہنی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

نیتا اور شانتی اس کی مدد کے لیے دوڑیں۔ بہر حال تینوں کسی نہ کسی طرح پانی تک پہنچ گئیں۔ ریت کی تہہ میں بیٹھ جانے کے بعد انھوں نے ایک مگ کی مدد سے تینوں برتن پانی سے بھر لیے۔ دوسری عورتیں برابر دھکا پیل کر رہی تھیں اور ان سے جلدی کرنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔ آخر کار وہ اپنے برتن لے کر بھیڑ سے نکل آئیں۔

''اوہو۔ یہ تو بہت بھاری ہے۔'' نیتا نے پانی کا برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو۔ تمھیں کیا توقع تھی؟'' شانتی نے حقارت آمیز انداز میں پوچھا۔ ''یہ برتن بہر حال پانی سے بھرا ہوا ہے، پروں سے نہیں۔''

نیتا نے برتن کو کولہے پر رکھ لیا جب کہ دوسری دونوں لڑکیوں نے برتن اپنے سر پر رکھے ہوئے تھے۔ نیتا کو آگے بڑھنے والے ہر قدم کے ساتھ بوجھ بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ اس کے ہاتھ اور کندھے اینٹھنا شروع ہوگئے۔ اس نے برتن کو زمین پر رکھ کر چند لمحوں کے لیے سانس درست کرنے کی کوشش کی۔ شانتی اور موہنی نے جو بڑے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھ چکی تھیں گھوم کر اسے دیکھا اور بے صبری سے اس کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

''بے وقوف لڑکی۔ پانی سے بھرا ہوا ذرا سا برتن اٹھا کر بھی نہیں چل سکتی۔'' شانتی بڑبڑائی ''میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ اسے لے کر مت چلو۔'' موہنی نے اسے چپ کرنے کی کوشش کی لیکن نیتا نے اس کے یہ حقارت آمیز جملے سن لیے تھے۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔

''بہتر یہ ہوگا کہ تم اسے اپنے سر پر رکھ لو۔'' موہنی نے نرمی سے اسے سمجھایا ''ادھر آؤ میں بتاؤں۔ سر پر رکھنے کے بعد گگرہ اتنا بھاری نہیں لگے گا۔''

اس نے اپنے دوپٹے کی اینڈی بنائی اور نیتا کے سر پر رکھ دیا اور پھر اس نے پانی کا گگرہ اس کے سر پر جما دیا۔ برتن اس کے سر پر توازن کے ساتھ رکھا گیا۔ نیتا احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ ان دونوں لڑکیوں کے پیچھے ہوتی گئی۔

''کاش ہم اسے اپنے ساتھ نہ لائے ہوتے'' شانتی نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''یہ کس قدر آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ ہمیں بھی دیر کرا رہی ہے۔ ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ سورج چڑھتا جا رہا ہے۔''

نیتا غصہ سے تمتمانے لگی۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح خود پر قابو پایا۔ اگر وہ کوئی غلط حرکت کرتی تو گر جاتی اور پھر شانتی کو یہ کہنے کا موقع مل جاتا ''میں نے تو پہلے ہی منع کیا تھا۔ ہمیں اسے ساتھ میں نہیں لانا چاہیے تھا۔''

''شہری کچھوے آگے بڑھو۔ اگر تھوڑا سا پانی گر گیا تو تمھارے خوب صورت کپڑے خراب نہیں ہوں گے۔ تیز قدم بڑھاؤ ورنہ ہم دھوپ کی تمازت میں پھنک کر رہ جائیں گے۔''

ان جملوں نے نیتا کے غصے کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔ اس کا اسکرٹ پہلے گیلا اور مٹیالا ہو چکا تھا اور بلاؤز بھی گندہ ہوگیا تھا۔ لیکن اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ اپنے کپڑوں کو بچانے کے لیے نہیں چل رہی تھی بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ قیمتی پانی چھلک کر ضائع نہ ہوجائے۔ یہ لڑکی شانتی کتنی خراب تھی اور اس کے ساتھ کیسی بے انصافی کررہی تھی۔ اس نے غصے میں اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ لیکن اف! یہ کیا ہوا۔ پانی کا گگرہ سر سے پھسل گیا۔ بمشکل تمام اس نے برتن کو پکڑا لیکن اتنے میں سارا پانی اس کے اوپر گر گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو اسے بڑا سرور محسوس ہوا کیوں کہ دھوپ میں تپتے جسم پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ بڑا لذت بخش تھا۔ لیکن پھر وہ اپنے حواس میں واپس آگئی۔

پانی کا برتن زمین پر گر چکا تھا اور اس کا سارا پانی پیاسی زمین میں جذب ہوگیا تھا۔

''دیکھا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ کاش ہم اسے اپنے ساتھ نہ لائے ہوتے'' شانتی چیختے ہوئے بولی۔ ''ہمیں دیر ہونے کی وجہ بھی.....''

نیتا کچھ اور سننا نہیں چاہتی تھی۔ ''ٹھیک ہے۔ اب میں تمھارے سامنے ثابت کردوں گی۔'' اس نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

''لیکن تم کہاں جارہی ہو'' موہنی نے دریافت کیا۔

''تم لوگ جاؤ۔ میرا انتظار مت کرو۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گی۔''

نیتا نے اسی طرف جاتے ہوئے کہا جدھر سے وہ ابھی آئے تھے۔

''اکیلی مت جاؤ'' موہنی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

نیتا نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ اب اسے تھکن بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہوئی جارہی تھی۔ اس کے دماغ میں صرف ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ اسے شانتی کو یہ دکھا دینا ہے کہ وہ کمزور قسم کی شہری لڑکی نہیں ہے۔ وہ بھی اتنی ہی مضبوط اور باصلاحیت ہے جیسی کہ اس کی دونوں بہنیں۔ غصہ اور عزم نے اس کے جسم میں بجلیاں بھر دی تھیں۔ وہ اپنی بہنوں کے سامنے اپنے آپ کو منوانے کی خواہش میں گرمی اور جھلسا دینے والی دھوپ یہاں تک کہ ہر چیز کو فراموش کر بیٹھی۔

جب وہ پانی کے سوراخ تک پہنچی تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے پانی کی تلاش میں چٹان تک دوڑ لگا دی۔ پانی تو موجود تھا لیکن اس کی سطح کم ہو چکی تھی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ پانی کا مگ لانا تو وہ بھول ہی گئی۔ اب وہ پانی کیسے بھرے گی۔؟ اس نے مایوسی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ اسے ٹین کا ایک پرانا ڈبہ دکھائی دیا جو ریت میں دبا ہوا تھا۔ اس نے ڈبے کو صاف کیا اور اسے پانی بھرنے کے لیے استعمال کرنے لگی۔

اس نے اپنے پورے بدن اور بالوں پر چھڑکاؤ کیا اور واپسی کا سفر شروع کردیا۔ راستے میں کچھ لوگ دکھائی پڑے۔ کبھی کبھی کوئی کسان نظر آجاتا، قریب سے بیل گاڑی گزر جاتی یا کوئی سائیکل سوار دکھائی دے جاتا۔ وہ اسے بغور اور پر تجسس نظروں سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے جس سے وہ خوفزدہ ہوجاتی۔ اس راستے پر اس وقت گزرنے والی غالباً وہ اکیلی لڑکی تھی۔ اس نے خوف کے احساس کو دور کیا اور مضبوطی سے قدم جماتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ اس کی نگاہ زمین پر تھی۔ وہ پتھر سے ٹھوکر کھا کر پانی کو دوبارہ ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

دھوپ کی گرمی تیز سے تیز تر ہوتی جارہی تھی۔ دھوپ کی شدت اس کے کھلے ہوئے بازوؤں اور گردن کو جلائے ڈال رہی تھی۔ اس کے ماتھے اور گالوں پر پسینہ بہہ رہا تھا۔ اس کے کپڑے اس کے جسم سے چپک کر رہ گئے تھے اور گرم زمین اس کے پیروں کو پھونکے ڈال رہی تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لیے نیم کے درخت کے نیچے آرام کیا اور پھر آگے بڑھ گئی۔ وہ شانتی کے سامنے ثابت کر دے گی...... اس نے دل ہی دل میں یہ بات دہرائی۔ لیکن وہ لڑکی اس قدر مذاق اڑانے والی اور متکبر کیوں تھی؟ اچانک اسے اس بات کا جواب مل گیا۔ اسے شانتی کے الفاظ یاد آئے۔ ''تمھارے خوب صورت کپڑے خراب نہیں ہو جائیں گے۔'' اسی جملے سے اس کے عجیب وغریب رویے کی وجہ کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کی چچازاد بہن اس سے حسد کرتی تھی۔ اس کی صورت اور اس کے خوب صورت کپڑوں نے اس کے اندر حسد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اسے شرمندہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ بے چاری لڑکی۔ نیتا نے طے کیا کہ وہ خود شانتی کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرے گی اور اسے شہر میں اپنے گھر آنے کی دعوت دے گی۔

دھوپ کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔ نیتا کو سخت گرمی لگ رہی تھی اور وہ پیاسی بھی تھی۔ وہ آم کے ایک درخت کے نیچے ٹھہر گئی۔ اس نے پانی کا گگرہ نیچے کیا اور بڑی احتیاط سے تھوڑا سا پانی اپنی ہتھیلی میں لیا اور اس سے حلق تر کیا۔ اس نے ذرا سا پانی اپنے گالوں، بال اور چہرے پر بھی چھڑک لیا۔ اس وقت اسے کتنا اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے تھکے ہوئے جسم میں توانائی دوڑ گئی۔

وہ پھر آگے روانہ ہوگئی۔ جس وقت وہ محسوس کر رہی تھی کہ اب ایک بھی اور قدم نہیں بڑھا سکے گی، جس وقت اس کا جسم آگ میں جھلسا جا رہا تھا اسے کچے مکان نظر آنے لگے۔ وہ خوشی میں دوڑ کر جانا چاہتی تھی لیکن پانی کے گر جانے کے خطرے کے پیش نظر وہ محتاط ہوگئی اور آہستہ لیکن مضبوط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

موہنی مکان کے باہر کھڑی ہوئی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شانتی گھر کے اندر تھی۔ جب اس نے موہنی کو چلاتے ہوئے سنا ''وہ آگئی ہے'' تو وہ بھی گھر کے باہر نکل آئی۔ ''ارے یہ تو پانی بھی لائی ہے'' شانتی کی آواز میں حیرت کے ساتھ ساتھ احترام بھی شامل تھا۔

''ہاں۔ بالکل نیتا پانی بھی لائی ہے۔'' موہنی نے اس کے سر پر سے پانی کا بھاری گگرہ اتارتے ہوئے کہا۔

نیتا اطمینان کا سانس لے کر لکڑی کی چارپائی پر ڈٹ گئی۔ پھر وہ سوچنے لگی۔ اس کی دونوں بہنیں کتنی محنت کرتی ہیں۔ میلوں پیدل چل کر ندی تک جانا، تیزی سے غائب ہوتے ہوئے پانی کو تلاش کرنا اور پھر بھاری گگرے سر پر رکھ کر لانا...... کس قدر محنت کا کام ہے اور وہ یہ کام اپنی ضرورت پورا کرنے کے لیے روزانہ ہی کرتی ہیں۔

''تم اچھی طرح ہاتھ پاؤں دھو لو'' موہنی کی اس بات پر وہ اپنے خیالات سے چونک پڑی۔ ''تمھیں گرمی لگ رہی ہوگی اور تھکن بھی محسوس ہو رہی ہوگی'' اس نے ایک بالٹی میں پانی لیا اور نیتا کے اوپر الٹ دیا۔

ٹھنڈے پانی سے اس کا رواں رواں خوش ہو گیا اور وہ خود کو تر و تازہ محسوس کرنے لگی۔

''لو پانی پیو، تم پیاسی ہوگی'' شانتی نے پیتل کا ایک بڑا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں گرمجوشی کی چمک تھی۔ نیتا نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس قبول کر لیا۔ ٹھنڈے پانی نے اس کے جسم میں نئی روح پھونک دی۔ اسے اپنے اندر توانائی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور خود کو تازہ دم محسوس کرنے لگی۔ پانی پیتے ہوئے نیتا نے ایک دل میں قسم کھائی۔

پانی ایک قیمتی شے ہے۔ یہ اتنی قیمتی چیز ہے کہ اسے ہنسی مذاق میں ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اب وہ گھنٹوں تک شاور کے نیچے کھڑی نہیں رہا کرے گی اور نہ ہی وہ بابو کو ٹب کے اندر پانی کا طوفان یا سیلاب لانے اور جہازوں سے کھیلنے کی اجازت دے گی۔

□□□

# قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

## نمک ستیہ گرہ کا سپاہی

**مصنفہ: سروجنی سنہا، مترجم: صفدر نقوی**

مہاتما گاندھی کی زندگی کے دو اصول تھے ستیہ اور اہنسا، اور ان پر وہ تاحیات قائم رہے۔ انھوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے ستیہ گرہ کا راستہ اختیار کیا اور ملک کو آزاد کرایا۔ اس کتاب میں نمک ستیہ گرہ کی تاریخ بیان کی گئی ہے جس کے 17 سال بعد نہ صرف ہندستان آزاد ہوا بلکہ دیگر کئی غلام ملکوں کو بھی آزادی نصیب ہوئی۔

صفحات: 87، قیمت: -/20 روپے

## نیتاجی سبھاش چندر بوس

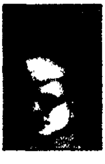

**مصنفین: ڈاکٹر لکشمی سہگل، کرنل پی. کے. سہگل، بی. جی. ورما، مترجم: راشد انور راشد**

سبھاش چندر بوس ہمارے ان عظیم مجاہدین آزادی میں سے ہیں جنھوں نے مادر وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان تک کی پروا نہ کی۔ نیتاجی نے آزاد ہند فوج کی ... انگریزی حکومت سے ... یہ بات ... ان کتاب میں سبھاش چندر بوس نے حالات زندگی کے ساتھ ساتھ ملک کی جد و جہد آزادی کی تاریخ بھی پیش کی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/25 روپے

## ڈاکٹر راجندر پرشاد

**مصنف: عبداللطیف اعظمی**

ڈاکٹر راجندر پرشاد ہمارے ملک کے ان لیڈروں میں سے ہیں جو ملک کو آزادی دلانے کے لیے آگے آگے تھے اور جنھوں نے بڑھ چڑھ کر آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا۔ ملک کی آزادی کے بعد انھیں پہلا صدر جمہوریہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس کتاب میں اختصار کے ساتھ ڈاکٹر راجندر پرشاد کی پوری زندگی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صفحات: 41، قیمت: 11 روپے

## سرسید احمد خاں

**مصنف: میر نجابت علی**

سرسید احمد خاں ہمارے عظیم قومی رہنما تھے 1857 کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریزوں کے عتاب کا شکار ہو کر جس طرح بے بسی اور بے سہ پرسی کی زندگی گزار رہے تھے، اس سے نجات دلانے اور انھیں نئی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے لیے سرسید نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ یہ کتاب ملک و قوم کے اس عظیم سپوت کا تعارف پیش کرتی ہے جس نے ہندستانی مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ سے ہمکنار کیا۔

صفحات: 24، قیمت: -/7 روپے

## حالی

**مصنفہ: صالحہ عابد حسین**

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

قیمت -/15 روپے

## محمد حسین آزاد

**مصنف: نند کشور وکرم**

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آب حیات، دربار اکبری، نیرنگ خیال اور سخندان فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

## [illegible]

**مصنف: جگن ناتھ آزاد**

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی محفل احباب کی جھڑپوں سے بڑے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں لکھیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اقبال کی حیات اور شاعری کی چھان پھٹک کے لیے وقف کر رکھی تھی، اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

## جوش [illegible]

**مصنف: ظفر محمود**

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جس سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ :- طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔


**قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان**

ویسٹ بلاک-1، وِنگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

**URDU DUNIYA** Monthly, January 2006, Vol. 8, Issue:1 Date of Publication:24/12/2005
*National Council for Promotion of Urdu Language*
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi.

# قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

## کلیات محمد قلی قطب شاہ

**مرتب: سیدہ جعفر**

گولکنڈہ کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدرشناس اور خود ایک غزل گو شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈہ کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

**صفحات:823، قیمت-/175 روپے**

## کلیات سراج

**مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری**

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جاتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ دوسری کیفیات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات نہایت ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و تلاش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں مبسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

**دوسرا ایڈیشن: صفحات:732، قیمت:-/138 روپے**

## کلیات عیش

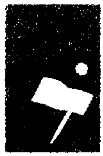

**مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو**

حکیم آغا جان عیش دہلوی، ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ [illegible] ان کی [illegible] انھوں نے اپنا مرتب دیوان اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں [illegible] مفصل مقدمے کے ساتھ۔

**پہلا ایڈیشن: صفحات:556، قیمت:-/80 روپے**

## گلشن بے خار

**مصنف: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ**

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے [illegible] فارسی میں لکھا تھا اور اس کے بعض بیانات اس دور کے شعرا کا ذکر [illegible] آج بھی دہرائے جاتے ہیں [illegible] اہمیت کا حامل تذکرہ [illegible] ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔

**پہلا ایڈیشن: صفحات:430، قیمت-/128 روپے**

## انیس کے مرثیے

**مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین**

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے قدیم و جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام اہم مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی [illegible]۔

**جلد اوّل، دوسرا ایڈیشن: صفحات:540، قیمت:-/36 روپے**

**جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات:575، قیمت:-/40 روپے**

## کلیات فانی

**مرتب: ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی**

حسرت، اصغر، جگر اور فانی کو ان کی زندگی ہی میں غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دے دی گئی تھی لیکن ان میں سے ہر شاعر کا انداز جداگانہ ہے۔ فانی کی خصوصیت ان کی حزن پسندی ہے جس نے ان کے کلام میں ایک خاص اثر پیدا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے مرتبہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ فانی کی دوسری نظمیں، قصیدے، قطعات وغیرہ بھی شامل ہیں۔ شروع میں مرتب نے فانی کی شخصیت اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

**دوسرا ایڈیشن: صفحات:318، قیمت:-/63 روپے**

## کاشف الحقائق

**مصنف: سید امداد امام اثر**

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یورپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ [illegible] اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نامور شاعروں کا تفصیلی بیان ہے [illegible] اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت [illegible] کا مبسوط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

**دوسرا ایڈیشن: صفحات:740، قیمت-/145 روپے**

## اڑیسہ میں اردو

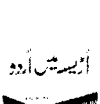


**مصنف: ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری**

ڈاکٹر حفیظ اللہ نیولپوری کی یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اڑیسہ میں اردو کا تاریخی اور لسانی پس منظر بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا باب اڑیسہ میں اردو شاعری [illegible] دو فصلوں میں منقسم ہے [illegible] صحافت [illegible] اڑیسہ میں [illegible] اردو تعلیم کی صورت حال [illegible] اردو کے ادبی اور ثقافتی اداروں [illegible] خلاصہ پیش کیا گیا ہے [illegible]۔

**پہلا ایڈیشن: صفحات:504، قیمت:-/157 روپے**

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110 066, Editor S. Mohan. Tel : 26103381, 26103938.